ماہنامہ
جولائی 2025ء

طلوعِ اسلام

لاہور
اشاعت کا اکیاسی واں سال

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

لَا نَبِیَّ بَعْدِیْ (الحدیث)

حضرت محمد ﷺ کے بعد نبوت کا ہر دعویٰ باطل ہے

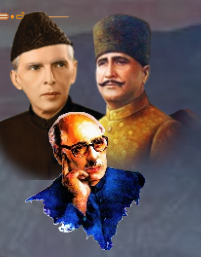

علامہ اقبالؒ کے ایماء اور قائداعظمؒ کی خواہش پر 1938ء سے شائع ہونے والا ماہنامہ

میں سلیم! تمہیں اپنا سینہ چیر کر درد و کرب کی ان تلاطم خیزیوں کو کس طرح دکھاؤں جنہوں نے مجھ پر راتوں کی نیند اور دن کا چین حرام کر رکھا ہے سلیم!

مرے دیدۂ تر کی بے خوابیاں مرے نالۂ نیم شب کا نیاز

تم نہیں دیکھ سکتے۔ میں پاکستان کے وسیع و عریض خطہ پر نگاہ ڈالتا ہوں تو عام طور پر یہ دیکھتا ہوں کہ

نہ کہیں لذّتِ کردار نہ افکارِ عمیق

اور ایک ٹھنڈی سانس سے یہ کہہ کر خاموش ہو جاتا ہوں کہ

آہ! محکومی و تقلید و زوالِ تحقیق

(سلیمؒ کے نام" علامہ پرویزؒ)

09 جولائی 1903ء
24 فروری 1985ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پرویز صاحب کے علمی اسلوب تحقیق کی تائید

قرآنی نظریات کی روشنی میں مغرب کے غلط تصورات کی تردید میں محترم پرویز اور ہمارے ہاں کے مفکرین نے بہت کچھ لکھا ہے۔ ان میں سے ڈاکٹر علامہ اقبالؒ، ڈاکٹر رفیع الدین احمد اور ڈاکٹر برہان احمد فاروقی کی تصنیفات سے چند اقتباسات پیش کئے جا رہے ہیں۔ جب بھی قارئین ان اقتباسات کی روشنی میں محترم پرویز صاحب کی تصنیفات کا جائزہ لیں گے تو وہ ان تمام خوبیوں کو بشمول دیگر خوبیوں کے ان میں پائیں گے۔ اس موضوع پر محترم پرویز صاحب کا موقف جاننے کے لئے خصوصی طور پر ان کی تصانیف ''انسان نے کیا سوچا'' اور ''اسلام کیا ہے'' ملاحظہ فرمائی جاسکتی ہیں۔

(1) ڈاکٹر علامہ اقبالؒ کا موقف:

1- عقل اور وحی میں تصادم نہیں بلکہ دونوں لازم وملزوم ہیں۔

2- قرآن سے راہنمائی حاصل کرنے کے لئے ضروری ہے کہ:

(الف) اپنے زمانوں کے تقاضوں اور اپنے دور کی فکری کاوشوں سے متعارف ہوں۔

(ب) قرآن کریم کو عربی زبان اور تصریفِ آیات کی رو سے سمجھنا چاہئے اور اس پر خارجی عناصر کو اثرانداز نہیں ہونے دینا چاہئے۔

(2) ڈاکٹر محمد رفیع الدین کا موقف:

مغرب کے غلط فلسفیانہ تصورات کی تردید قرآنی نظریات سے کرتے ہوئے مصنف کے لئے ضروری ہے کہ:

1- وہ روحِ قرآن کے ساتھ پوری پوری واقفیت پیدا کریں جس کے بغیر قرآنی اور غیر قرآنی تصورات میں تمیز کرنا مشکل ہوگا۔

2- وہ مغرب کے غلط تصورات کے اصل ماخذ اور ان کے متبعین کے طرز خیال وعمل سے پوری پوری واقفیت پیدا کریں۔

3- وہ علم کے تمام شعبوں سے یعنی مادی، حیاتیاتی اور نفسیاتی علوم اور فلسفہ سے جو ان علوم کو جمع کر کے ایک مکمل نظریہ کائنات ترتیب دیتا ہے، اس حد تک واقف ہوں کہ ان کی ساری وسعت میں جہاں کہیں کوئی اسلامی تصور موجود ہو اسے پہچان کر لے سکیں اور استخراج اور استنباط سے مزید صحیح اسلامی تصورات کو اخذ کر سکیں۔

بقیہ صفحہ نمبر 66 پر

ماہنامہ
طلوعِ اسلام
لاہور
جولائی 2025ء

جلد 78 | شمارہ نمبر 07

اس شمارے میں

عنوان	مصنف	صفحہ نمبر
لمعات: نابالغ کا نکاح قرآن کی روشنی میں	ادارہ	4
مقدمہ (معارف القرآن، جلد اوّل)	علامہ حافظ محمد اسلم جیراجپوری	6
مصنوعی ذہانت اور وحی	آصف جلیل، لاہور	32
پیامِ فصلِ بہار	علامہ غلام احمد پرویز علیہ الرحمۃ	35
ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لئے	محمد انوار خان، اسلام آباد	56

ENGLISH SECTION

Manzil ba Manzil (منزل بہ منزل)
Chapter 4: Builder of Kaaba (*Mei'mar Haram* - معمارِ حرم) – To leaders of Spring's caravan 60
(Tulu-e-Islam Convention, April, 1960)
By G. A. Parwez (Translated by: M. Alam)
Episode No. 2

چیئرمین: خورشید انور

مجلسِ ادارت
ڈاکٹر انعام الحق، ڈاکٹر اعجاز رسول
اقبال ادریس ایڈووکیٹ

مدیر انتظامی: محمد سلیم اختر

قانونی مشیر: ملک محمد سلیم ایڈووکیٹ

ادارہ کا مضمون نگار کی تحریر سے کُلّی اتفاق ضروری نہیں۔

زرِ تعاون: 50 روپے فی پرچہ
پاکستان: 600 روپے سالانہ
رجسٹرڈ ڈاک: 1000 روپے سالانہ

ادارہ طلوعِ اسلام B-25 گلبرگ 2، لاہور 54660، (پاکستان)
Phone: 042-35714546
Cell: +92 310-4800818
Cell: +92 318 2221851
idarati@gmail.com
www.facebook.com/Talueislam

Bank Account Idara Tolu-e-Islam
National Bank of Pakistan, Main Market Branch Gulbarg Lahore

For Domestic Transactions	For International Transactions
Bank A/C No: 0465004073177672	IBAN:PK36NBPA0465004073177672 Swift Code: NBPAPKKAA02L

ادارہ طلوعِ اسلام (رجسٹرڈ) کی مطبوعات سے حاصل شدہ جملہ آمدن قرآنی فکر عام کرنے پر صَرف کی جاتی ہے

ناشر: عرفان راٹھور اشتیاق اے مشتاق پرنٹرز سے چھپوا کر B-25، گلبرگ II لاہور سے شائع کیا

طلوعِ اسلام

غلامی میں نہ کام آتی ہیں شمشیریں نہ تدبیریں
جو ہو ذوقِ یقیں پیدا تو کٹ جاتی ہیں زنجیریں
کوئی اندازہ کرسکتا ہے اُس کے زورِ بازو کا!
نگاہِ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں
ولایت، پادشاہی، علم اشیا کی جہاں گیری
یہ سب کیا ہیں، فقط اک نکتۂ ایماں کی تفسیریں
براہیمی نظر پیدا مگر مشکل سے ہوتی ہے
ہوس چھپ چھپ کے سینوں میں بنالیتی ہے تصویریں
تمیزِ بندہ و آقا فسادِ آدمیّت ہے
حذر اے چیرہ دستاں! سخت ہیں فطرت کی تعزیریں
حقیقت ایک ہے ہر شے کی، خاکی ہو کہ نوری ہو
لہو خورشید کا ٹپکے اگر ذرّے کا دل چیریں
یقیں محکم، عمل پیہم، محبت فاتحِ عالم
جہادِ زندگانی میں ہیں یہ مردوں کی شمشیریں

چہ باید مرد را طبع بلندے، مشرب نابے
دلِ گرمے، نگاہِ پاک بینے، جانِ بیتابے

(بانگِ درا۔ علامہ اقبالؒ)

(جاری ہے)

ادارہ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

لمعات

نابالغ کا نکاح قرآن کی روشنی میں

گذشتہ دنوں پاکستان کی قومی اسمبلی میں 18 سال سے کم عمر کی شادی کو قابلِ سزا جرم قرار دینے کا قانون پاس ہوا۔ اس پر ملک کے مختلف طبقوں میں بحث چل پڑی ہے۔ مذہبی جماعتوں نے اس کے خلاف احتجاجی جلوسوں کی دھمکی بھی دی ہے آیئے دیکھتے ہیں طلوعِ اسلام کا موقف اس سلسلہ میں قرآن کی روشنی میں کیا ہے۔

قرآن نے نکاح کو ایک معاہدہ قرار دیا ہے۔ جو تراضیٔ مابین (فریقین کی مرضی) سے طے پاتا ہے۔ وَّاَخَذۡنَ مِنۡکُمۡ مِّیۡثَاقًا غَلِیۡظًا (4:21) دنیا کے ہر قانون میں معاہدہ (Contract) کے لئے بالغ ہونا شرط ہے۔ قرآن کا اعجاز ملاحظہ فرمایئے کہ اس نے بلوغت کو نکاح سے تعبیر کیا ہے یعنی بلوغت اُسے کہتے ہیں جب لڑکا یا لڑکی نکاح کی عمر کو پہنچ جائے۔ سورۃ النساء کے شروع میں مذکور ہے کہ جب کوئی بچے یتیم رہ جائیں تو تم اُن کے اموال و جائیداد کی حفاظت کرو اور ان کی دیکھ بھال کرتے رہو۔ حَتّٰۤی اِذَا بَلَغُوا النِّکَاحَ ۚ (4:6) یہاں تک کہ وہ نکاح کی عمر کو پہنچ جائیں۔ اُس وقت اُن کے اموال و جائیداد ان کے سپرد کر دو۔ (بشرطیکہ وہ فاتر العقل نہ ہوں) یہاں یہ حقیقت بلا شک و شبہ سامنے آ گئی کہ قرآن کی رُو سے نکاح کی عمر بلوغت کی عمر ہے۔ بلوغت سے پہلے نکاح ہو نہیں سکتا۔ پھر دوسری جگہ اس کی بھی صراحت فرما دی کہ تم عورتوں کے زبردستی مالک نہیں بن سکتے۔ لَا یَحِلُّ لَکُمۡ اَنۡ تَرِثُوا النِّسَآءَ کَرۡهًا ؕ (4:19) یہ قطعاً جائز نہیں کہ تم عورتوں کے زبردستی مالک بن جاؤ۔ یعنی مرد اس عورت سے شادی کرے جو اُسے پسند ہو۔ مَا طَابَ لَکُمۡ مِّنَ النِّسَآءِ (4:3) لیکن عورت کی مرضی کے خلاف زبردستی اس سے نکاح نہیں کیا جا سکتا۔ ان تصریحات سے واضح ہے کہ بلوغت سے قبل نہ لڑکے کا نکاح

نکاح ہے اور نہ لڑکی کا عقد عقد۔ اور یہ تلاعب بالدین (دین سے مذاق) ہے اور دُنیا و آخرت میں رسوائی کا موجب۔ نکاح کے لئے ایجاب وقبول ایک لاینفک شرط ہے۔ اور ظاہر ہے کہ کسی بچہ کا ایجاب وقبول کچھ معنی ہی نہیں رکھتا۔ ''ایجاب وقبول'' کی رسم اب بھی ہمارے ہاں رائج ہے۔ لیکن جس طرح آج کل اس کی مٹی پلید ہورہی ہے (بالخصوص لڑکیوں کے معاملہ میں) وہ ظاہر ہے۔

ہمارے ہاں نابالغ تو ایک طرف بالغ لڑکیوں سے بھی کون پوچھتا ہے کہ تمہارا نکاح کہاں کیا جائے۔ منوسمرتی (ہندوؤں کی معاشرت) میں لڑکی کے متعلق لکھا ہے کہ اُسے ساری عمر دوسروں کی مرضی کے تابع رہنا ہوگا۔ لڑکی ہے تو ماں باپ کی، بیوی ہے تو مرد کی، بیوہ ہے تو لڑکے کے رحم وکرم پر۔ وہ دنیا میں کچھ بھی اپنی مرضی سے نہیں کرسکتی۔ یہی کچھ ہمارے ہاں ہورہا ہے۔

بہرحال جیسا کہ پہلے لکھا جاچکا ہے۔ قرآن کی رُو سے بلوغت سے پہلے نکاح ہونہیں سکتا اور نکاح کے لئے بہرحال فریقین کی رضامندی ضروری ہے۔ لیکن ہماری بدبختی کہ ہمارے ہاں نکاح نابالغ نہ کہ مروج ہی ہے، بلکہ اُسے ''عین دین'' سمجھا جاتا ہے۔ ہمیں یاد پڑتا ہے کہ جب ہندوستان میں ساردا بل پیش ہوا ہے جس کی رُو سے نکاح نابالغاں ناجائز قرار دیئے جانے کی تجویز تھی تو اُس بل کی مخالفت میں سناتنی ہندوؤں کی ہم نوائی میں مسلمان بھی نہایت شد و مد سے شریک ہوئے۔ اور اس انداز سے شریک کہ گویا وہ بل ان کے دین کے کسی بنیادی رکن کو منہدم کررہا تھا۔ ہمارے اربابِ شریعت کبھی کسی مسئلہ پر متفق نہیں ہوئے۔ مختلف فرقے، مختلف مسائل میں اپنے اپنے مسلک کے پابند رہتے ہیں اور آپس میں ہمیشہ مصروف جدل و پیکار ــــ لیکن یہ ہماری سوختہ بختی کی انتہا تھی کہ ساردا بل کی مخالفت میں مسلمانوں کے تمام فرقے متحد اللسان تھے، اور اس باب میں جو وفدِ عظیم وائسرائے کے پاس پہنچا تھا۔

اس میں قریب قریب ہر فرقے کے نمائندے موجود تھے۔ یہ تمام اربابِ شریعت ایک عیسائی حکمران کے حضور یہ کہنے کے لئے جارہے تھے کہ اس ہندو کے بل کو پاش نہ کیا جائے جو نابالغوں کا نکاح ناجائز قرار دے رہا ہے۔ ان کا وفد یہ کہنے جارہا تھا اور آسمان ان کی اس حرکت پر روتا تھا اور دُنیا ہنستی تھی۔

علامہ حافظ محمد اسلم جیراجپوری

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

مقدمہ

(معارف القرآن، جلد اوّل)

(یہ مقدمہ علامہ غلام احمد پرویز علیہ الرحمہ کی سلسلہ معارف القرآن کی پہلی تصنیف کے لئے علامہ حافظ اسلم جیراجپوری رحمۃ اللہ نے لکھا تھا یہ اہم تحریر پرویز علیہ الرحمہ کے یوم پیدائش 9 جولائی کے سلسلہ میں قارئین طلوعِ اسلام کے ذوق کی نذر کی جارہی ہے)

اللہ نے قرآن اتار کر بنی نوع انسان پر اپنی نعمت پوری کر دی اور اپنے اس دین کو جس کو انسانوں کی آغاز آفرینش سے ان کی ہدایت کے لئے بنایا تھا اس کتاب کریم میں مکمل کر دیا اور اعلان کر دیا کہ:

اَلۡیَوۡمَ اَکۡمَلۡتُ لَکُمۡ دِیۡنَکُمۡ وَاَتۡمَمۡتُ عَلَیۡکُمۡ نِعۡمَتِیۡ وَرَضِیۡتُ لَکُمُ الۡاِسۡلَامَ دِیۡنًا ؕ (5:3)

آج میں نے تمہارا دین تمہارے لئے مکمل کر دیا اور اپنی نعمت تمہارے اوپر پوری کر دی اور تمہارے لئے دین اسلام کو پسند کیا۔

قرآن کریم ایسی صاف عربی زبان میں نازل ہوا جس کو عام طور پر اہل عرب سمجھتے تھے۔ خود قرآنی آیات میں اس کی زبان ''عربی مبین'' کہی گئی ہے یعنی کھلی ہوئی اور واضح۔ بلکہ اس سے بھی آگے بڑھ کر اس نے اپنے کو ''نور مبین'' کہا ہے۔ نیز قرآنی آیات کو بھی ''آیات بیّنات'' کے نام سے موسوم کیا ہے۔

بَلۡ ہُوَ اٰیٰتٌۢ بَیِّنٰتٌ فِیۡ صُدُوۡرِ الَّذِیۡنَ اُوۡتُوا الۡعِلۡمَ ؕ (29:49)

بلکہ وہ کھلی ہوئی آیتیں ہیں ان لوگوں کے سینوں میں جن کو علم دیا گیا ہے۔

الغرض قرآن کی زبان، قرآن کی تعلیم اور قرآنی آیات کا مفہوم سب خود قرآن کے بیان کے مطابق واضح، کھلا ہوا اور جگمگاتا ہوا نور ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس نے بار بار تصریح کی ہے کہ:

وَلَقَدۡ یَسَّرۡنَا الۡقُرۡاٰنَ لِلذِّکۡرِ فَہَلۡ مِنۡ مُّدَّکِرٍ ﴿۱۷﴾ (54:17)

ہم نے قرآن کو نصیحت لینے کے لئے آسان بنا دیا ہے۔ کوئی ہے جو نصیحت لے۔

نصیحت لینے کی آسانی کو دیکھنے کے لئے خود اہل عرب پر نظر ڈالنا کافی ہے جو قرآن کے اولین مخاطب اور بالعموم بدوی اور ناخواندہ تھے جس کی وجہ سے قرآن نے ان کو ''اُمّیّین'' کا لقب دیا اور فرمایا۔

هُوَ الَّذِیْ بَعَثَ فِی الْاُمِّیّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ (62:2)

وہی ہے جس نے اٹھایا ان پڑھوں میں انہیں میں سے ایک رسول۔

ان امیوں نے بے تکلف قرآن کو سمجھا اور اس کے اوپر عمل کیا اور کامیاب ہوئے۔ علامہ ابن خلدون لکھتے ہیں:

ان القرآن نزل بلغة العرب علی اسالیب بلاغتهم وکانوا کلهم یفهمونه، ویعلمون معانیه فی مفرداته وتراکیبه ❶

قرآن عرب کی زبان میں ان کے انداز بلاغت کے مطابق نازل ہوا، ہر ایک اس کو سمجھتا تھا اور اس کے مفردات و مرکبات کے معانی کا علم رکھتا تھا۔

علامہ موصوف کا مقصد غالباً یہ ہے کہ اہل عرب بالعموم قرآن سے اس کی تعلیمات کو سمجھتے تھے۔ ورنہ یہ تو ظاہر ہے کہ ہر فرد امت عربیہ کا اس کے جملہ الفاظ کے معانی اور اس کی تمام تراکیب کی تفصیلات کا عالم نہیں ہوسکتا تھا۔ ہاں وہ ایک سادہ مفہوم اس کا ضرور سمجھ لیتے تھے اور ہر ایک آیت کے تفصیلی معانی تک پہنچنے کی تکلیف لازمی خیال نہیں کرتے تھے۔ لیکن اس سے یہ اندازہ کر لینا کہ وہ بالعموم آیات کے سرسری مفہوم پر قانع تھے صحیح نہیں ہوسکتا۔ ابوعبدالرحمن سلمیؒ سے روایت ہے کہ صحابہؓ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے دس آیتیں سیکھتے تھے تو جب تک ان کی علمی اور عملی حقیقت کو جان نہ لیتے تھے آگے نہیں بڑھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ ہم میں سے جب کوئی شخص سورۂ بقرۃ اور آل عمران پڑھ لیتا تھا تو ہماری نگاہوں میں محترم ہوجاتا تھا ❷۔

حقیقت یہ ہے کہ قرآن کریم میں زیادہ تر آیات محکمات ہیں جو اصول دین اور احکام شریعت سے تعلق رکھتی ہیں یا انبیاء کرام علیہم السلام اور اقوام سابقہ کے نتیجہ خیز اور عبرت انگیز قصص ہیں۔ ان کا سمجھنا جمہور کے لئے آسان ہے، مگر اسی کے ساتھ وہ حقائق غامضہ بھی ہیں، جن کو صرف راسخون فی العلم ہی سمجھ سکتے ہیں اور صحابہ کرامؓ میں ایسے حضرات کی کمی نہیں تھی، لیکن اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ان کی نگاہوں میں اس کا عملی پہلو غالب تھا۔ یہاں اس بات کی تصریح کی ضرورت ہے کہ ظاہری اور عملی حیثیت کے علاوہ قرآن کریم کی نظری اور عقلی حیثیت بھی اہم ہے۔ یہ چھوٹی سی کتاب جو آسانی کے ساتھ صرف چند اجزاء میں نمایاں اور صاف لکھی جاسکتی ہے، قیامت تک کے لئے امت اسلامیہ کا دستور العمل بنائی گئی ہے اور ہر زمان اور ہر مکان میں ان کی ہدایت کا نصاب قرار دی گئی ہے۔ اگر یہ ایسے حقائق جادوانی پر مشتمل نہ ہوتی جن کو ابدال آباد تک انسانی نسلیں ختم نہیں کرسکیں گی، تو کیونکر ان کا دائمی نصاب ہدایت بننے کی صلاحیت رکھتی؟ یہی وجہ ہے کہ قرآن سے صرف عملی نصیحت ہی لینے کی ہدایت نہیں کی گئی بلکہ اس میں تفکر اور تدبر کی بھی تاکید فرمائی گئی ہے، مثلاً

كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَيْكَ مُبٰرَكٌ لِّيَدَّبَّرُوْٓا اٰيٰتِهٖ (38:29)

مبارک کتاب ہم نے تیری طرف نازل کی ہے، تا کہ لوگ اس کی آیتوں میں غور کریں۔

❶ مقدمہ ابن خلدون، صفحہ: 367،
❷ مسند امام احمد

دوسری جگہ ہے۔

اَفَلَا یَتَدَبَّرُوۡنَ الۡقُرۡاٰنَ اَمۡ عَلٰی قُلُوۡبٍ اَقۡفَالُہَا ﴿۴۷:۲۴﴾

کیا وہ قرآن میں غور نہیں کرتے یا دلوں پر ان کے قفل پڑے ہوئے ہیں۔

ایک اور آیت ہے:

وَاَنۡزَلۡنَاۤ اِلَیۡکَ الذِّکۡرَ لِتُبَیِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَیۡہِمۡ وَلَعَلَّہُمۡ یَتَفَکَّرُوۡنَ ﴿۱۶:۴۴﴾

اور ہم نے تیری طرف قرآن اتارا تاکہ لوگوں کے لئے جو اتارا گیا ہے اس کو ان کے سامنے بیان کر دے اور تاکہ لوگ اس میں تفکر کریں۔

الغرض اہل نظر کو قرآن نے اپنی آیات میں فکر و نظر کی دعوت دی ہے، تاکہ وہ ان سے اپنی ہدایت لیتے اور اپنی فلاح کا راستہ نکالتے رہیں۔ اس کا دعویٰ ہے۔

اِنۡ ہُوَ اِلَّا ذِکۡرٌ لِّلۡعٰلَمِیۡنَ ﴿۸۱:۲۷﴾

وہ نہیں ہے مگر سارے عالموں کے لئے نصیحت۔

یعنی جملہ بنی نوع انسان کے لئے خواہ وہ کسی عالم، کسی ماحول، کسی زمان اور کسی مکان میں ہوں۔

تاریخ تفسیر:

یہی وجہ تھی کہ عہد رسالت میں فقہاء صحابہؓ اس کی آیات میں تدبر کرتے تھے اور بعض امور کو جو ان کے سامنے فی الجملہ واضح نہیں ہوتے تھے، خود رسالت مآب ﷺ سے دریافت کرتے تھے، لیکن بہت کم، کیونکہ کثرت سوال کی آفتوں سے وہ اچھی طرح واقف تھے۔

علامہ سیوطی نے اپنی مفید کتاب الاتقان فی علوم القرآن کی آخری فصل میں ان تمام تفسیری روایتوں کو جمع کر دیا ہے، جو صحابہؓ کے توسط سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے آئی ہیں، وہ کل کی کل ان کی کتاب کے بیس صفحوں سے بھی کم ہیں اور تنقید صحیح کے بعد تو بہت ہی تھوڑی رہ جاتی ہیں۔ پھر وہ بھی زیادہ تر الفاظ کے معانی کے متعلق ہیں۔

مفسرین صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین:

جن صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین سے یہ تفسیر کی روایتیں آئی ہیں، ان میں سے جو حضرات خصوصیت کے ساتھ ممتاز ہیں، وہ خلفاء اربعہ، عبداللہ بن مسعود، ابی بن کعب، زید بن ثابت اور عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہم ہیں۔ ان میں سے حضرات شیخین سے بوجہ ان کے تقدم عہد اور امور ملت میں مشغولیت کے نہایت کم روایتیں ہیں۔ حضرت عثمانؓ اگرچہ قرآن سے اس قدر شغف رکھتے تھے کہ رات کا بڑا حصہ کھڑے ہو کر اس کی تلاوت میں گذارا کرتے بلکہ کبھی کبھی خشوع و خضوع میں جب محویت کا عالم طاری ہو جاتا تو ایک ہی آیت کو بار بار گھنٹوں تک دہراتے رہتے مگر تفسیر کی روایتیں ان سے بھی بہت کم مروی ہیں۔ زیادہ روایتیں حضرت علیؓ سے کی گئی ہیں، جو شوق دلاتے رہتے تھے کہ لوگ قرآن سیکھیں اور سمجھیں اور اپنے خطبوں میں فرمایا کرتے تھے کہ تم کو کتاب اللہ کی بابت جو کچھ پوچھنا ہے میری زندگی ہی میں مجھ سے پوچھ لو، کیونکہ میں علم رکھتا ہوں کہ کون سی آیت کہاں اتری، کب اتری اور کس کی بابت اتری اور دربار نبوی میں مَیں سوال کی جرأت بھی زیادہ رکھتا تھا[1]۔

[1] مراۃ التفسیر، صفحہ:9

حضرت عبداللہؓ بن مسعود سے بھی زیادہ روایتیں آئی ہیں، جو سابقین اولین میں سے تھے اور جن کا لقب بوجہ اس کے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر رہتے اور آپ ﷺ کی نعلین بھی اٹھاتے تھے، صاحب النعلین تھا۔ انہوں نے خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے قرآن کی ستر سورتیں یاد کی تھیں اور اپنے تمام اندزِ عمل میں آپ کے ساتھ سب سے زیادہ مشابہت پیدا کر لی تھی۔ ان کی وفات 33ھ میں ہوئی۔ حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ خزرجی انصاری عہدِ رسالت ﷺ میں کاتب وحی تھے اور صحابہ رضی اللہ عنہم میں سید القراء اور قرآن کے عالم مانے جاتے تھے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے عہد میں انتقال فرمایا اور انہوں نے ان کے جنازہ کی نماز پڑھائی۔

حضرت زیدؓ بن ثابت کاتب دربار رسالت ﷺ نجباء انصار اور علماء قرآن میں سے تھے اور آنحضرت ﷺ نے اپنی عمر کے آخری رمضان میں قرآن کا جو دور فرمایا تھا، اسمیں شریک تھے، جس کی وجہ سے عہد صدیقی میں جب قرآن ایک کتاب کی شکل میں جمع کیا گیا یہی اس کے جامع قرار پائے۔ حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ بن عباس ان کی رکاب تھاما کرتے تھے اور کہتے تھے کہ علماء کی تکریم اسی طرح کرنی چاہئے۔ 48ھ میں وفات پائی مگر ان دونوں حضرات یعنی ابی بن کعب رضی اللہ عنہ اور زید بن ثابت سے تفسیریں کم مروی ہیں۔ سب سے زیادہ روایتیں حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ بن عباس سے آئی ہیں جن کا لقب بوجہ قرآن دانی کے حبرامت اور ترجمان القرآن تھا۔ ان کے حق میں صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا مانگی تھی کہ ''اللھم فقھه فی الدین و علمه التاویل'' اے اللہ اس کو دین کی فقاہت اور قرآن کی فہم عطا فرما۔ یہ اگرچہ صغار صحابہ میں سے تھے، مگر حضرت عمر رضی اللہ عنہ ان کی عقل وفراست اور قرآن فہمی کی وجہ سے ان کو اپنی مجلس شوریٰ میں شریک رکھتے اور مشکل امور میں رائے لیتے تھے۔ ان کا انتقال 68ھ میں ہوا۔

ان حضرات کے علاوہ ابوموسیٰ اشعری، عبداللہ بن عمر، عبداللہ بن زبیر، جابر بن عبداللہ، ابوہریرہ، انس بن مالک اور ام المومنین حضرت عائشہ و دیگر صحابہ رضی اللہ عنہم سے بھی تفسیریں منقول ہوئی ہیں۔

اکثر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بہ نظر احتیاط انہیں معانی پر اکتفا کرتے تھے، جو بعض الفاظ یا آیاتِ قرآن کی تشریح کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مسموع ہوئے تھے۔ خود قرآن کی تفسیر میں کچھ کہنے سے پرہیز کرتے تھے۔ چنانچہ ابن سیرین نے کہا ہے کہ میں نے عبیدہ سے ایک آیت کی تفسیر پوچھی تو انہوں نے کہا اللہ سے ڈرو اور سیدھے چلے چلو، لیکن بعض صحابہ مثلاً ابن مسعود اور ابن عباس وغیرہ رضی اللہ عنہم قرآن میں تدبر اور تفکر کو ضروری سمجھتے تھے۔ ان کے نزدیک جو چیز ناجائز تھی، وہ یہ تھی کہ بلاحقیقت کو پہنچے اور اچھی طرح سمجھے ہوئے آیات کی تفسیر کی جائے یا بعض اہل مذاہب مثلاً خارجی، شیعہ، قدری، مرجی وغیرہ جو اس وقت پیدا ہو چکے تھے، ان کے عقائد کے مطابق تاویل کی جائے [1]۔

اس زمانہ میں تفسیر کے لئے عربی زبان، جاہلیت کے رسوم و عادات جن کو قرآن نے مٹایا ہے، عہدِ رسالت ﷺ

[1] فجر الاسلام، صفحہ:235

کے واقعات جن کا تعلق قرآن سے ہے، رسول اللہ ﷺ کے اقوال، اعمال اور قضایا وغیرہ جاننا ضروری تھا، انہیں کی مدد سے آیات کی تشریح کرتے تھے۔

اسرائیلیات:

قرآن میں دینی تعلیم کے علاوہ ایسے تاریخی حقائق بھی مذکور ہوئے ہیں، جن کا علم اصلاح نفوس بشری کے لئے ضروری ہے، مثلاً عالم کی تکوین، آدم کی پیدائش اور انبیاء سابقین اور اقوام گذشتہ کے واقعات۔ انسانی طبیعت کا خاصہ ہے کہ جب کسی شے کا ذکر سنتی ہے، تو اس کے متعلق مزید معرفت کی خواہش اس میں پیدا ہوتی ہے، اس لئے عہدِ صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین میں لوگ ان امور کو ان علماء اہل کتاب سے جو اسلام لا چکے تھے، دریافت کرتے تھے۔ خود حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ جرامت بھی ابن جریر طبری کے بیان کے مطابق کعب احبار کے پاس بیٹھتے اور ان کی روایتوں کو اخذ کرتے تھے۔ اگرچہ رسول اللہ ﷺ نے آگاہ کر دیا تھا کہ ''اہل کتاب کے اقوال کی نہ تصدیق کرو، نہ تکذیب'' مگر چونکہ ان امور کا تعلق اعمال شریعت کے ساتھ نہ تھا اس وجہ سے ان کے لینے میں کوئی ہرج نہیں سمجھا گیا۔ اس طرح پر اہل کتاب کی روایتیں بھی تفسیر قرآن میں شامل ہو گئیں۔ علامہ ابن خلدون نے لکھا ہے کہ:

> ''بالعموم عرب نہ پہلے سے اہل کتاب تھے، نہ علم رکھتے تھے۔ ان کے اوپر بدویت غالب تھی۔ جب ان کو موجودات کے اسباب، ابتدائے تخلیق اور امم سابقہ کے حالات وغیرہ کے جاننے کا شوق ہوتا، تو ان اہل کتاب سے جو مسلمان ہو گئے تھے، دریافت کرتے۔ یہ بھی زیادہ تر ان ہی کی طرح بدوی تھے اور ان امور کو اسی قدر جانتے تھے جس قدر عوام اہل کتاب۔ انہیں کے بیانات لوگوں سے منقول ہو کر آیات کی تفسیروں میں داخل ہو گئے اور بوجہ اس کے کہ ان کا تعلق احکام شریعہ سے نہ تھا، تدوین کے وقت مفسروں نے مسامحت سے کام لے کر ان کی تنقید کی طرف توجہ نہیں کی اور انہیں کو کتب تفاسیر میں درج کر دیا[1]۔''

عہدِ رسالت ﷺ میں اہلِ کتاب میں سے جو حضرات اسلام لائے تھے، ان میں سے سب سے پہلے یہودی عالم جن کو قرآن کریم نے ''اَوَلَمۡ یَکُنۡ لَّهُمۡ اٰیَةً اَنۡ یَّعۡلَمَهٗ عُلَمٰٓؤُا بَنِیۡۤ اِسۡرَآءِیۡلَ ﴿۱۹۷﴾'' (26:197) کہہ کر اہل علم میں شمار کیا ہے، حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ ہیں جو ہجرت نبوی کے بعد ہی مدینہ میں اسلام لائے، ان کا انتقال 40ھ میں ہوا۔ ان سے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ اور انس بن مالک نے روایت کی ہے۔

دوسرے حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ ہیں۔ یہ اصلاً مجوس بلکہ ایک آتشکدہ کے متولی کے عزیز فرزند تھے۔ گھر سے نکل کر ملک شام میں گئے، وہاں عیسائیت اختیار کر لی، ایک مدت تک ن صیبین اور اس کے بعد عموریہ میں رہے اور آسمانی کتابوں کا علم حاصل کیا پھر عرب کی طرف آئے وادی القریٰ میں بنی کلب نے غداری سے ان کو غلام بنا لیا اور فروخت کر ڈالا۔ قسمت کی یاوری سے مدینے پہنچے۔ وہاں آنحضرت ﷺ

[1] مقدمہ، صفحہ: 367

کی خدمت میں حاضر ہو کر اسلام لائے' حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی خلافت میں مدائن میں وفات پائی ❶۔

جس طرح حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو حبشیوں نے اور حضرت صہیب رضی اللہ عنہ کو رومیوں نے اپنا قومی افتخار اور نمونہ بنایا اسی طرح اہل فارس نے اسلام لانے کے بعد حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کو اپنی قوم کا پیش رو قرار دیا' ان کے حالات میں غیر معمولی باتیں بڑھائیں اور ان کی طرف بہت سی روایتیں منسوب کیں' بالخصوص صوفیائے عجم نے جن میں سے اکثر اپنا سلسلۂ ارادت ان تک پہنچاتے ہیں۔

تیسرے صحابی جن سے اس قسم کی روایتیں آئی ہیں حضرت تمیم رضی اللہ عنہ داری ہیں جو 9ھ میں مدینہ میں آ کر مسلمان ہوئے تھے۔ یہ نصاریٰ یمن میں سے تھے اور قصہ گوئی کرتے تھے' یعنی گذشتہ انبیاء اور اقوام کے حالات سناتے تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خلافت میں ان سے قصہ گوئی کی اجازت طلب کی' مگر انہوں نے منظور نہیں فرمایا۔ آخر میں ان کے بہت اصرار کی وجہ سے صرف اس قدر اجازت دی کہ جمعہ کے دن اس سے پہلے کہ میں جماعت کے لئے نکلوں' تم قصے سنا لیا کرو۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے عہد میں ان کو ہفتہ میں دو دن کی اجازت مل گئی ❷۔ جساسہ اور دجال کی روایتیں انہیں سے مروی ہیں۔

اس قصہ گوئی کی دو صورتیں ہوتی تھیں' ایک قصص عامہ کہ قصّاص مسجد میں مسلمانوں کے مجمع میں بیٹھ کر ان کو دوسری قوموں کے وہ حکایات اور حالات سناتا' جو اس نے اپنے بزرگوں سے سنے تھے' دوسری قصص خاصہ جو کسی مخصوص بڑے آدمی کے سامنے بیان کئے جاتے تھے ❸۔

عہدِ صحابہ رضی اللہ عنہم ہی میں قصہ گوئی کا رواج عوام کی دلچسپی کی وجہ سے بہت بڑھ گیا اور چونکہ قصے کذب آمیز بلکہ زیادہ تر بے بنیاد افسانے ہوتے تھے اس وجہ سے حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنے زمانہ میں قصہ گویوں کو مسجدوں میں بیٹھنے کی ممانعت کر دی' بجز حسن بصری رضی اللہ عنہ کے کہ وہ سچائی کا خیال رکھتے تھے ❹۔

تابعین

عہدِ صحابہ رضی اللہ عنہم کے بعد روایت تفسیر میں مندرجہ ذیل حضرات نے زیادہ شہرت پائی۔

عکرمہ مولے ابن عباس رضی اللہ عنہ جو ان کے مخصوص ترین شاگرد بھی تھے۔ یہ اپنے آقا یعنی عبداللہ رضی اللہ عنہ بن عباس' نیز حضرت عائشہ اور ابو ہریرہ وغیرہ رضی اللہ عنہم سے روایت کرتے ہیں۔ 105ھ میں وفات پائی۔

عطاء بن ریاح۔ یہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ' اسامہ بن زید' حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا' ام سلمہ رضی اللہ عنہا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ اور بعض دیگر صحابہ رضی اللہ عنہم سے روایت کرتے ہیں۔ علماء مکہ میں فتوے کی ریاست انہیں پر منتہی تھی۔ 114ھ میں وفات پائی۔

ضحاک بن مزاحم خراسانی: یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ' ابن عمر رضی اللہ عنہ' زید بن ارقم رضی اللہ عنہ اور انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں۔ ان کی تاریخ وفات 105ھ ہے۔

سعید رضی اللہ عنہ بن جبیر کوفی: یہ ابن عباس رضی اللہ عنہ' عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ اور ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں۔ 95ھ میں حجاج بن یوسف کے حکم سے قتل کئے گئے۔

مجاہد رضی اللہ عنہ بن جبیر: یہ بھی حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کے

❶ طبقات ابن سعد جلد:4، صفحہ:53، ❷ اصابہ جلد:1، صفحہ:184' ❸ خطوط نفریزی جلد:2' صفحہ:253 ❹ فجر الاسلام' صفحہ:188

شاگرد ہیں اور زیادہ انہیں سے روایت کرتے ہیں۔ 103ھ میں مکہ میں عین سجدہ کی حالت میں وفات پائی۔

حسن بصری رضی اللہ عنہ: یہ انس بن مالک رضی اللہ عنہ، جندب بن عبداللہ رضی اللہ عنہ اور بعض دیگر صحابہ رضی اللہ عنہم سے روایت کرتے ہیں۔ 110ھ میں انتقال فرمایا۔

ان کے علاوہ امام مسروق، زید بن اسلم، قتادہ، ابوالعالیہ، ربیع بن انس اور عونی وغیرہ۔ اس طبقہ کے علماء تفسیر میں ممتاز ہیں۔ امام بن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے کہ تفسیر کا علم زیادہ علماء مکہ میں تھا، جو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کے شاگرد تھے، مثلاً عکرمہ، مجاہد اور عطا، پھر اہل کوفہ میں جو حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کے اصحاب تھے، جیسے حسن بصری رضی اللہ عنہ اور مسروق وغیرہ۔

اس عہد میں اسرائیلیات میں بہت اضافہ ہوا، کیونکہ عوام کا رجحان ان کی طرف بڑھ گیا تھا اور وہ اس کو علمی تحقیق سمجھنے لگے تھے کہ قرآن میں جن انبیاء علیہم السلام اور اقوام کے قصص ہیں، ان کے متعلق مزید حالات کا پتہ لگائیں۔ اس لئے جزئی سے جزئی اور چھوٹی سے چھوٹی باتیں بھی دریافت کرنے لگے مثلاً سفینۂ نوح علیہ السلام کی مقدار اور وسعت، اس میں جن جان داروں کے جوڑے لادے گئے تھے، ان کے اقسام، حضرت ابراہیم علیہ السلام کے قصہ میں چاروں پرندوں کے انواع، حضرت خضر علیہ السلام کے ذکر میں غاصب بادشاہ کا خاندان اور اس بچہ کا نام ونسب جس کو خضر علیہ السلام نے قتل کیا تھا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے واقعہ میں ان کی بیوی کے متعلق تحقیق کہ وہ حضرت شعیب علیہ السلام کی چھوٹی بیٹی تھیں یا بڑی۔ پھر یہ کہ انہوں نے آٹھ یا دس سال کی دونوں مدتوں میں سے کون سی مدت پوری کی۔ اصحاب کہف کے نام اور ان کے کتے کے رنگ ونسل، غرض اسی قسم کی سینکڑوں بلکہ ہزاروں امور کی بابت جن کو قرآن کریم نے لایعنی اور غیر ضروری ہونے کی وجہ سے چھوڑ دیا تھا، بحث وتفتیش کرنے لگے۔ یہی معلومات روایات کے ذریعہ سے پھیلیں اور جب تفسیریں مدون ہوئیں تو ان میں درج کی گئیں۔ ان روایات کا سب سے بڑا مرجع دو شخص ہیں ایک کعب بن ماتع جو یمن کے یہودی تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں اسلام لائے اور مدینہ میں رہنے لگے۔ یہ کعب احبار کے نام سے مشہور ہیں۔ ان سے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ اور ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کے توسط سے زیادہ روایتیں آئی ہیں۔ دوسرے وہب بن منبہ یہ بھی یمن کے یہودی مگر فارسی الاصل تھے۔ ان کی وفات صنعاء میں 110ھ میں ہوئی۔ اسرائیلیات میں ان کا بڑا حصہ ہے۔ علماء ثقات مثلاً ابن قتیبہ یا امام نووی وغیرہ نے ان کی کوئی روایت اپنی کتابوں میں درج نہیں کی۔ ابن جریر طبری نے اگرچہ ان سے قطعی پرہیز تو نہیں کیا ہے۔ مگر بہت کم روایتیں لی ہیں۔ لیکن ثعلبی وغیرہ نے انبیاء علیہم السلام کے قصوں میں زیادہ تر انہیں کی مرویات درج کی ہیں [1]۔ یہاں اس حقیقت کا بھی ظاہر کر دینا ضروری ہے کہ اس زمانہ میں عرب کے ہر حصہ سے زیادہ یہودی ثقافت یمن میں شائع تھی۔ یہی وجہ ہوئی کہ وہاں کے اہل کتاب مسلمانوں سے اس قسم کی روایتیں زیادہ منقول ہوئیں۔

اتباع تابعین:

اس طبقہ میں بالعموم حاملین روایت کی تعداد بہت

[1] فجر الاسلام، صفحہ: 190

زیادہ ہوگئی۔ ان میں سے جن کے نام تفسیر کے ساتھ مشہور ہوئے، حسب ذیل ہیں:

عطاء بن دینار متوفی 126ھ، مقاتل بن سلیمان متوفی 150ھ، سفیان ثوری متوفی 161ھ، وکیع بن الجراح متوفی 196ھ، سفیان بن عیینہ متوفی 198ھ، نیز ابن جریج، اسحاق بن راہویہ، آدم بن ایاس، عبدالرزاق، اور امام مالک وغیرہ۔

اس طبقہ کے لوگوں نے تفسیر میں کتابیں بھی مدون کرنی شروع کیں، چنانچہ تاریخوں میں ان میں سے بعض تفاسیر کا ذکر ہے، مثلاً تفسیر ابن جریج، تفسیر سفیان بن عیینہ، تفسیر وکیع بن الجراح، تفسیر شعبہ، تفسیر ابوبکر بن ابی شیبہ وغیرہ۔ مگر یہ سب کی سب ضائع ہوگئیں اور ان میں سے کوئی بھی امت کے ہاتھوں میں باقی نہیں رہی۔

ان کا طریقہ یہ بیان کیا گیا ہے کہ اپنے شیوخ سے جو روایتیں قرآن کی تفسیر میں سنتے، ان کو قلم بند کرلیتے تھے۔ بڑا حصہ اسرائیلیات کا ہوتا تھا، جس کی وجہ ہم پہلے ظاہر کر چکے ہیں۔ اس طبقہ میں ان روایات کے بطل کبیر ابن جریج ہیں، جن کی نسبت بعض ائمہ جرح وتعدیل نے تصریح کی ہے کہ روایتیں وضع کرتے تھے [1]۔ یہ 80ھ میں اسلام لائے تھے اور 150ھ میں انتقال کر گئے۔ امام ذہبی نے لکھا ہے کہ رومی الاصل تھے اور امام شافعی کا قول نقل کیا ہے کہ ابن جریج نے 90 عورتوں سے متعہ کیا تھا [2]۔ ابن خلکان کے بیان کے مطابق سب سے پہلی تفسیر اسلام میں انہوں نے ہی مدون کی۔ تبع تابعین کا سلسلہ دوسری صدی ہجری کے خاتمہ تک پہنچتا ہے۔ اس کے بعد ان کے شاگردوں کا زمانہ آتا ہے۔ اس عہد یعنی تیسری صدی ہجری میں تدوین کتب عام ہوگئی۔ اسی میں صحاح ستہ لکھی گئیں، جن میں تفسیر کی روایتیں کتاب التفسیر کے عنوان سے سورتوں کی ترتیب پر جمع کی گئی ہیں۔ ان کا بھی عام انداز وہی ہے جو ان کے اساتذہ کا تھا، یعنی انہوں نے جستہ جستہ الفاظ و آیات قرآن کے متعلق متقدمین سے جو روایتیں سنی ہیں ان کو درج کر دیا ہے۔ یہ روایتیں بالعموم صحابہ کرام یا ان کے تلامذہ کی ہیں، خال خال ہیں جو رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم تک مرفوع ہیں۔ کتب صحاح ستہ کی تفسیروں کے یہ ابواب اس قدر مختصر ہیں کہ کسی سورہ کے ایک یا دو لفظوں اور کسی سورہ کی صرف ایک یا دو آیتوں کے متعلق روایات درج کی گئی ہیں۔ اگرچہ یہ روایات قرآن کی تفسیر کے لئے نہایت اہمیت رکھتی ہیں، مگر خود ان سے ان کا کوئی گوشہ بھی سیراب نہیں ہوتا۔

تنقید وتفسیر

زیادہ تر اسی زمانہ یعنی تیسری صدی ہجری میں ائمہ جرح وتعدیل نے راویوں اور روایتوں کی تنقید کی، تفسیری روایات کا بڑا حصہ بوجہ ان کے رواۃ کے ضعف کے مشکوک ثابت ہوا، کیونکہ ضحاک بن مزاحم، مقاتل بن سلیمان، ابو صالح مصری، محمد بن سائب کلبی، السدی محمد بن مروان، بشر بن عمار اور عوفی وغیرہ جن سے زیادہ تر یہ روایتیں آئی ہیں، جانچنے سے کمزور بلکہ بعض ان میں سے وضاع نکلے [3]۔

میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں حضرت علی رضی اللہ عنہ اور عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کے نام سے تفسیر کی روایتیں زیادہ آئی ہیں اور یہی رواۃ کی کمزوری کی وجہ سے

[1] فجر الاسلام، صفحہ:242 [2] تذکرۃ الحفاظ، جلد 1، صفحہ:153۔ [3] مراۃ التفسیر، صفحہ 20 سے صفحہ 28 تک،

عام طور پر موضوع اور مجعول نکلیں جس کی وجہ یہ ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے شیعہ انہیں اقوال کو زیادہ احترام اور قبولیت کی نظر سے دیکھتے تھے جو ان کے نام کے ساتھ منسوب ہوں' اس لئے شیعہ رواۃ بیشتر انہیں کے نام سے روایتیں کرتے تھے' بلکہ جو بات ان کے ذہن میں ایسی آتی تھی جس سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کا رتبہ ظاہر ہو اس کو بھی انہیں کی طرف منسوب کر دیتے تھے' چنانچہ ابن ابی جمرہ نے روایت کی ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ میں اگر چاہوں تو صرف فاتحہ کی تفسیر سے ستر اونٹوں کا بوجھ تیار کر دوں [1]۔ وضع کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے نام سے جو روایات کی گئی ہیں' ان کی کل تعداد 686 ہے جن میں سے ائمہ حدیث کے نزدیک اصول کی رو سے صرف پچاس صحیح ہیں [2]۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ جن کی نسل سے خلفاء عباسیہ تھے مقربین بارگاہ کا مخصوص موضوع تھے۔ قرآن کریم کی کوئی آیت بلکہ کوئی لفظ خالی نہ ہوگا جس کی تفسیر میں ان سے روایت نہ کی گئی ہو۔ ان کی کل روایتوں کی تعداد 1660 ہے [3]۔ جن میں سے امام شافعی کے قول کے مطابق زیادہ سے زیادہ سو ایسی ہیں' جو صحیح مانی گئی ہیں [4]۔

ابن عباس سے روایت کے جتنے طرق ہیں' ان میں سب سے معتبر طریقہ ''ابن صالح عن علی بن ابی طلحہ عن ابن عباس'' ہے' مگر جملہ حفاظ حدیث کا اجماع ہے کہ علی بن ابی طلحہ کی لقاء حضرت ابن عباس سے ثابت نہیں ہے۔ وہ جو کچھ ان کے نام سے کہتے ہیں دراصل مجاہد اور سعید بن جبیر کی روایتیں ہوتی ہیں۔ دوسرا طریق جس کو محدثین نے شیخین یعنی امام بخاریؒ اور مسلمؒ کی شرط کے مطابق تسلیم کیا ہے۔ قیس عن عطاء بن السائب عن سعید بن جبیر عن ابن عباس ہے۔ مگر اس سلسلہ سے صرف چند ہی روایات ہیں۔ باقی دوسرے تمام طرق مجروح ہیں۔ جویبر عن ضحاک سخت ضعیف سلسلہ ہے۔ ابن جریج نے جو کچھ روایت کیا ہے' اس کی صحت کا خیال ہی نہیں رکھا۔ کلبی کی روایتیں سب سے زیادہ کمزور ہوتی ہیں اور اسکے ساتھ جب مروان بن محمد بھی شامل ہو جائے تو یہ سلسلہ سرتاپا کذب ہوجاتا ہے [4]۔

یہی وجوہات ہیں جن کی بناء پر بعض اکابر ائمہ نے تفسیری روایتوں کی صحت کا سرے سے انکار ہی کر دیا۔ چنانچہ امام احمدؒ بن حنبل کا جو جرح و تعدیل کے امام اور بخاریؒ و مسلمؒ کے استاد ہیں' قول ہے کہ تین کتابیں ہیں جن کی کوئی اصلیت نہیں' مغازی' ملاحم اور تفسیر [5]۔

ہر چند کہ امام موصوف کے اس قول میں تاویل کی گنجائش نہیں ہے' لیکن ان کے تلامذہ نے کہا ہے کہ اس سے ان کی مراد یہ ہے کہ بیشتر حصہ ان روایات کا ناقابل اعتماد ہے۔ غالباً اس تاویل سے ان کا منشا یہ ہے کہ ائمہ حدیث نے جن تفسیری روایتوں کو اصول حدیث کے مطابق صحیح قرار دیا ہے وہ اس سے مستثنیٰ ہیں' مگر حقیقت یہ ہے کہ جو روایتیں صحیح قرار دی گئی ہیں ان میں بھی تنقید کی ضرورت ہے' مثلاً القناطیر المقنطرہ کی تفسیر میں امام حاکم نے حضرت انس رضی اللہ عنہ

---

[1] فجر الاسلام' صفحہ:238 [2] الملل والنحل لابن جزم' جلد نمبر:4' صفحہ:137 [3] مراۃ التفسیر' صفحہ 13
[4] اتقان' جلد نمبر:2' صفحہ:195 [5] تذکرۃ الموضوعات للشیخ محمد طاہر' صفحہ:82

سے روایت کی ہے کہ قنطار ایک ہزار اوقیہ کا ہوتا ہے اور ابن ماجہ میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ بارہ ہزار اوقیہ کا۔ ظاہر ہے کہ ان دونوں میں سے صرف ایک ہی صحیح ہو سکتی ہے، مگر محدثین نے دونوں کو صحیح کہا ہے [1]۔

مکمل تفسیریں:

تیسری صدی ہجری کے اواخر اور چوتھی صدی ہجری میں پورے قرآن کی تفسیریں لکھی گئیں، مثلاً تفسیر ابن جریر طبری متوفی 310ھ تفسیر ابن منذر متوفی 318ھ، تفسیر بن ابی حاتم متوفی 327ھ، تفسیر امام حاکم متوفی 359ھ، تفسیر بن حیان متوفی 369ھ وغیرہ ان میں سے ہر ایک نے صحابہ رضی اللہ عنہم، تابعین اور ان کے بعد کے علماء سے روایات درج کی ہیں خود اپنی طرف سے کوئی بات نہیں لکھی ہے۔ بجز ابن جریر طبری کے جن کا طریقہ یہ ہے کہ وہ ہر آیت کو نقل کرنے کے بعد اس کے ایک ایک لفظ کے معانی لکھتے ہیں۔ متقدمین کے جو اختلافات ہوتے ہیں ان کو اسناد کے ساتھ درج کرتے ہیں، پھر خود ان میں سے ایک کو ترجیح دے کر اس کے وجوہ لکھ دیتے ہیں۔ الفاظ سے گذر کر آیات کے مفہوم کے متعلق بھی ان کا رویہ بعینہ یہی ہے۔ کہیں کہیں استنباط مسائل اور وجوہ اعراب سے بھی بحث کرتے ہیں۔ الغرض ان کی تفسیر اسلام میں پہلی تفسیر ہے جس میں مولف نے اپنی دماغی کوشش اور ذہنی کاوش سے بھی کام لیا ہے اور ہر موقع پر اس کی شخصیت نظر آتی ہے۔ دراصل ان کی تفسیر اس کل قرآنی علم کا مجموعہ ہے، جو اس وقت تک علماء اسلام کے پاس تھا۔ امام نووی نے لکھا ہے کہ امت کا اجماع ہے کہ ابن جریر طبری جیسی تفسیر کسی نے نہیں لکھی۔ امام ابو حامد اسفرائینی کا قول ہے کہ اگر کسی نے چین تک کا سفر کر کے بھی تفسیر طبری کو حاصل کر لیا تو کوئی بڑی زحمت نہیں اٹھائی [2]۔ آج روئے زمین پر پورے قرآن کی سب سے پہلی تفسیر یہی ہے، یہ ام التفاسیر بولی جاتی ہے، کیونکہ زمانہ مابعد میں جتنی تفسیریں لکھی گئیں، سب کی سب اسی سے ماخوذ ہیں۔ اس میں خرابی صرف یہ ہے کہ رطب و یابس ہر قسم کی روایات درج کر دی گئی ہیں، لیکن چونکہ سند ہر روایت کی اس کے ساتھ ہے، اس وجہ سے جانچنا نہایت آسان ہے۔ امام ابن تیمیہ کے شاگرد رشید حافظ ابن کثیر نے اسی کا خلاصہ اور تنقیح کر کے اپنی تفسیر مرتب کی ہے۔

علمی تفسیریں

اب تک جس قدر تفسیریں لکھی گئی تھیں، وہ خالص منقولی تھیں، یعنی روایات کا مجموعہ، لیکن چوتھی صدی ہجری میں مسلمانوں میں مختلف قسم کی علمی تحریکات پیدا ہو گئی تھیں۔ صرف و نحو، بلاغت و معانی، فقہ و اصول، منطق و فلسفہ، کلام و تصوف وغیرہ کا عام رواج ہو چکا تھا۔ ان علوم کے حاملین نے جو تفسیریں لکھیں، ان میں بیشتر اپنے فنی زاویہ نظر سے الفاظ و آیات کی تشریح میں بحثیں شروع کیں اور روایات کے ساتھ ساتھ اجتہاد کا دروازہ بھی کھول دیا۔ علاوہ بریں نئے نئے مذہبی فرقے بھی پیدا ہو گئے تھے ان اہل مذاہب نے بھی اپنے اپنے عقائد و خیالات کے مطابق آیات کی تفسیریں کیں، جن کی وجہ سے اختلافات کی بہت کثرت ہو گئی اور تفسیروں کی نوعیتیں متعدد ہو گئیں، مثلاً زجاج اور کسائی

[1] اتقان جلد:4، صفحہ:199 [2] مراۃ التفسیر، صفحہ:38

وغیرہ نے جو صرف ونحو کے امام تھے، اپنی تفسیروں میں خصوصیت کے ساتھ لفظی تصرفات اور وجوہ اعراب سے بحثیں کیں۔ ثعلبی اور ابن اثیر نے جن کو تاریخ کا ذوق تھا، قصص کی تفصیلوں کی طرف رجحان رکھا۔ فقیہہ ابواللیث سمرقندی اور علامہ قرطبی نے فروعات فقہہ پر آیات سے استدلال میں توجہ صرف کی۔ ابومسلم اصفہانی اور زمخشری نے معتزلی عقائد کے اثبات کی کوشش کی۔ اسفرائینی اور رازی نے اشعری اصول کے مطابق متکلمانہ بحثیں لکھیں، عبدالقاہر جرجانی اور ابو ہلال عسکری نے بلاغت و معانی کے لطائف ظاہر کئے۔ محی الدین ابن عربی اور واحدی وغیرہ نے تصوف کا رنگ بھرا اور شیعہ مفسروں نے آیات کو اپنے مذہبی خیالات کے مطابق بنانے سے سروکار رکھا۔ غرض اس وقت سے لے کر مفتی محمد عبدہٗ اور سرسید احمد خاں تک ہر زمانہ کی تفسیر اس زمانہ کی علمی بحثوں اور تحریکوں سے متاثر اور ہر فرقہ کی تفسیر اس کے عقائد وخیالات کی آئینہ نظر آتی ہے۔

ان وجوہات سے اگرچہ تفسیروں میں وسعت تو بہت پیدا ہوگئی، لیکن بیجا تاویلات کا بھی راستہ کھل گیا اور اکثر فرقوں نے آیات قرآن کو اپنے خیالات کے مطابق اس طرح ڈھالنے کی کوششیں کیں، جن کو معنوی تحریف کہنا بجا ہے۔ اس بے اعتدالی کی سب سے بڑی وجہ یہ ہوئی کہ تفسیر کے اصول نہیں متعین کئے گئے۔ علماء اصول نے جو کچھ لکھا ہے وہ الفاظ کے استعمال کے متعلق چند عام قیاسی قاعدے ہیں، جو بالکل ناکافی ہیں۔ علامہ فناری نے تصریح کی ہے کہ علم تفسیر میں بجز چند امور کے اصول مطلقاً نہیں ہیں، جن پر اس کی جزئیات کا مدار ہو [1]۔

شرائط تفسیر:

متاخرین نے مفسر کے لئے کم سے کم پندرہ علوم جاننے کی شرط لگائی ہے۔ لغت، اشتقاق، صرف، نحو، معانی، بیان، بدیع، قرأت، کلام (اصول دین) اصول فقہ، اسباب نزول، قصص، ناسخ ومنسوخ، فقہ اور حدیث [2]۔

لیکن یہ امر غور طلب ہے کہ یہ تمام علوم مسلمانوں میں دوسری بلکہ تیسری صدی ہجری میں رائج ہوئے ہیں، جس سے پہلے ہی قرآن کریم کو حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم وتابعینؒ اور تبع تابعینؒ صحیح اور بہتر طریقہ سے سمجھتے رہے، بلکہ اگر غور سے دیکھا جائے تو ان علوم مشروطہ کا م آخذ خود قرآن ہے، اسی سے علماء نے ان کو نکالا ہے، پھر یہ فہم قرآن کے لئے شرط کیونکر قرار دیئے جاسکتے ہیں۔ غالباً ان لوگوں کا مقصد جنہوں نے ان علوم کو شرط گردانا ہے، یہ ہوگا کہ ان سے فہم قرآن میں مدد ملتی ہے، ورنہ ان میں سے اکثر تو قیاسی علوم ہیں، جن میں غلطی کے پہلو بھی نکل آتے ہیں۔ چنانچہ وہ مفسرین جن کی تفسیروں کو علماء نے قابل اعتراض قرار دیا ہے، نہ صرف یہ کہ ان علوم سے اچھی طرح واقف تھے، بلکہ اپنی تفسیروں میں ان کے اصول کو مرعی بھی رکھتے تھے۔

کتب تفسیر

امام ابن جریر طبری کے بعد جس قدر تفسیریں لکھی گئیں ان کو کون شمار کرسکتا ہے؟ صرف کشف الظنون میں جو ایک کتب خانہ کی فہرست ہے، نو سو تفسیریں نام بنام مندرج ہیں۔ نواب صدیق حسن خاں مرحوم نے اپنی کتاب اکسیر

[1] مراۃ التفسیر، صفحہ:7 [2] اتقان جلد:2، صفحہ:187

میں اس سے بھی زیادہ تفسیریں گنائی ہیں۔ اگر دنیا کے تمام کتب خانوں کی فہرستیں دیکھ کر ان کی تعداد لکھی جائے تو آج بھی یقیناً کئی ہزار تک پہنچے گی۔ اس موقع پر بہ ترتیب زمانہ چند مشہور تفسیروں کا نام لکھنا غیر مناسب نہ ہوگا۔

چوتھی صدی ہجری میں تفسیر ابوالحسن اشعری امام اہل سنت متوفی 320ھ، تفسیر محمد بن علی اوفوی متوفی 388ھ اس کا نام استغنا فی علوم القرآن ہے اور ایک سو بیس جلدوں میں ہے تفسیر خلف بن احمد والی سیستان متوفی 399ھ یہ تفسیر سجستانی کے نام سے مشہور ہے اور سب سے بڑی تفسیر ہے۔

پانچویں صدی ہجری میں تفسیر ابن فورک متوفی 406ھ تفسیر ابن ابو طالب مکی متوفی 437ھ تفسیر امام ماوردی متوفی 450ھ، تفسیر ابومسلم اصفہانی متوفی 459ھ، تفسیر امام اسفرائینی متوفی 471ھ، تفسیر امام الحرمین استاد امام غزالی متوفی 478ھ، تفسیر راغب اصفہانی متوفی 500 ہجری۔

چھٹی صدی ہجری میں تفسیر امام غزالی متوفی 505ھ، جس کا نام یاقوت التاویل ہے اور چالیس جلدوں میں ہے، تفسیر امام بغوی محی السنۃ متوفی 516ھ، تفسیر کشاف جار اللہ زمخشری متوفی 524ھ تفسیر امام ابن الجوزی بغدادی متوفی 597ھ۔

ساتویں صدی ہجری میں تفسیر امام رازی متوفی 602ھ، تفسیر شیخ محی الدین ابن عربی متوفی 628ھ تفسیر سخاوی متوفی 643ھ تفسیر بیضاوی متوفی 682ھ۔

آٹھویں صدی ہجری میں تفسیر خازن شیخ علاؤالدین علی بن محمد بغدادی متوفی 725ھ، تفسیر بحر المحیط ابوحیان اندلسی۔

نویں صدی ہجری میں تفسیر علامہ مجدالدین فیروز آبادی صاحب قاموس متوفی 817ھ، تفسیر امام بلقینی متوفی 824ھ۔

اس کے بعد جو تفسیریں لکھی گئی ہیں وہ زیادہ تر انہیں تفسیروں کا خلاصہ یا التقاط ہیں۔ ان کے نام گنانے کی ضرورت نہیں ہے۔ البتہ ان چند تفسیروں کا ذکر ضروری ہے جو اپنی خصوصیات کے لحاظ سے امتیاز رکھتی ہیں۔ ان میں سب سے مقدم ابن جریر طبری کی تفسیر ہے، جس کی مختصر کیفیت ہم لکھ چکے ہیں۔ ہر زمانہ میں اہل علم اسی کو سب سے بہتر تفسیر تسلیم کرتے چلے آئے ہیں، گویا تشریح قرآن کے لحاظ سے وہی پہلی تفسیر ہے اور وہی آخری تفسیر، آج تک کوئی تفسیر اس کے رتبہ کی نہیں لکھی جا سکی۔

دوسری تفسیر، جس نے علماء ادب میں شہرت حاصل کی کشاف ہے، اس کے مولف علامہ زمخشری بلاغت و معانی کے امام تھے۔ انہوں نے اسی نوعیت سے یہ تفسیر لکھی، لیکن زیادہ زور پہلے ہی پارہ کی تفسیر میں صرف کر دیا ہے مگر اسمیں اپنی فن دانی کا جو مظاہرہ کیا ہے وہ بے نظیر ہے۔

تیسری تفسیر جو علماء معقول میں مقبول ہوئی، امام فخر الدین رازی کی تفسیر کبیر ہے، اس میں طویل الذیل فلسفیانہ بحثیں ہیں۔ یہ اس زمانہ میں لکھی گئی جب عالم اسلام میں منطق، فلسفہ اور علم کلام زیادہ رائج تھا، اس واسطے بہت قدر کی نگاہوں سے دیکھی گئی، لیکن اہل منقول نے اس کو پسند نہ کیا، کیونکہ علاوہ اس کے کہ اس میں بعض باتیں ان کے قدیم خیالات کے مطابق نہ تھیں، ان کو آیات کے ساتھ ان متکلمانہ مباحث کا جو ان کے تحت میں لکھے گئے ہیں، ربط نظر نہ آیا، یہاں تک کہ بعض بزرگوں نے کہہ دیا کہ ''رازی کی تفسیر میں سب کچھ ہے بجز تفسیر کے۔''

امام رازی نے ربط آیات کی طرف بھی جا بجا اشارات کئے ہیں۔ مگر ہر جگہ اس کا خیال نہیں رکھا۔ ان کے بعد علامہ شرف الدین ابوالفضل متوفی 655ھ نے اپنی تفسیر میں جو بیس جلدوں میں ہے اور تفسیر مرسی کے نام سے مشہور ہے، ہر ہر آیت کے باہمی ربط اور اس کے وجوہ کو تفصیل کے ساتھ بیان کرنے کی کوشش کی۔ اسی عنوان پر شیخ علی مہائمی متوفی 825ھ نے جن کا مزار بمبئی میں زیارت گاہ ہے، اپنی تفسیر تبصیر الرحمن لکھی۔ پھر شیخ ابراہیم بقاعی متوفی 885ھ نے تفسیر بقاعی تالیف کی، جو فی الجملہ اس سے بہتر سمجھی گئی۔ اس آخری زمانہ میں مولانا حمید الدین فراہی بھی ربط آیات کے عنوان سے تفسیر نظام الفرقان عربی زبان میں لکھ رہے تھے، جو ان کے انتقال کر جانے کی وجہ سے پوری نہ ہوسکی۔ صرف اس کے بعض اجزاء شائع ہوئے ہیں۔

آیات کے علاوہ سورتوں کی ترتیب اور ان کے باہمی تناسب پر شیخ ابو حیان نے اپنی تفسیر البرہان فی مناسبۃ ترتیب سور القرآن لکھی ہے۔ شیخ ابوالفیض فیضی اکبر آبادی متوفی 1004ھ کی تفسیر سواطع الالہام کسی معنوی خوبی کے لحاظ سے نہیں، بلکہ صرف اس وجہ سے قابل ذکر ہے کہ غیر منقوط الفاظ میں لکھی گئی ہے۔

موجودہ دور میں شیخ جوہری طنطاوی کی تفسیر مغربی علوم کو پیش نظر رکھ کر لکھی گئی ہے، لیکن علمی لحاظ سے بہترین تفسیر شیخ محمد عبدہ کی ہے، جس کی تکمیل ان کے شاگرد رشید علامہ سید رشید رضا، مدیر رسالہ ''المنار'' مصر کر رہے تھے، مگر افسوس ہے کہ ابھی نصف قرآن تک بھی نہیں پہنچے تھے کہ سید صاحب موصوف انتقال کر گئے اور یہ مفید تفسیر ناتمام رہ گئی۔

نصاب درس کے لئے علماء اہل سنت کو صحت مفہوم اور اختصار دونوں کا لحاظ رکھتے ہوئے سب سے بہتر تفسیر جلالین ملی، جو نصف قرآن تک شیخ جلال الدین محلی متوفی 864ھ اور بقیہ نصف شیخ جلال الدین سیوطی متوفی 911ھ کی لکھی ہوئی ہے۔ اسی قسم کی مختصر تفسیر مدارک بھی ہے جو علامہ نسفی کی تالیف ہے اور بعض مدارس میں پڑھائی جاتی ہے۔ تفسیر بیضاوی کا ابتدائی حصہ سورۂ بقرہ تک بھی پرانے مدارس میں پڑھا دیا جاتا ہے۔ بیضاوی دراصل تین اہم علمی تفاسیر کا خلاصہ ہے۔ جہاں تک معانی و بیان کا تعلق ہے، کشاف سے ماخوذ ہے۔ متکلمانہ بحثیں تفسیر کبیر رازی سے اور حقائق و لطائف تفسیر راغب اصفہانی سے [1]۔

علوم قرآن:

جب سے مسلمانوں میں مختلف علوم کا رواج ہوا اسی وقت سے اہل فن نے قرآن کے ایک ایک شعبہ پر جداگانہ بحثیں شروع کیں اور ان کے متعلق کتابیں تصنیف کرنے لگے۔ مثلاً لغات القرآن، اعراب القرآن، بدائع القرآن، قصص القرآن، احکام القرآن اور حجج القرآن وغیرہ۔ علامہ جلال الدین سیوطی نے الاتقان فی علوم القرآن میں ان علوم کی اسی انواع کا شمار کیا ہے اور ان کے اوپر جو مشہور تصنیفیں ہیں ان کو گنایا ہے، لیکن دراصل ان انواع کی تعداد اس سے بھی زیادہ ہے اور ہر ایک بجائے خود ایک مستقل موضوع ہے جس پر تصانیف کے انبار ہیں۔ مثلاً الفاظ القرآن، اس پر بہت سے علماء ادب ولغت نے مستقل کتابیں لکھی ہیں، جن

[1] قضاء الارب، صفحہ:238

میں سے ابوعبیدہ، ابوعمرو زاہد اور ابن درید کی کتابیں مشہور ہیں، ان سب کا مجموعہ العزیزی کی کتاب ہے، جس کو انہوں نے اپنے استاد ابوبکر ابن الانباری کی معیت میں پورے پندرہ سال کی محنت میں تیار کیا ہے۔ آخر میں راغب اصفہانی نے مفردات القرآن لکھی جو الفاظ قرآن کے متعلق سب سے مفید کتاب تسلیم کی گئی ہے۔

اسی طرح اعجاز القرآن پر امام خطابی، رمانی، زملکانی، فخر الدین رازی، ابن سافہ اور ابوبکر باقلانی کی کتابیں ہیں۔ اس زمانہ میں مصر کے نامور ادیب مصطفی صادق رافعی نے اپنی کتاب آداب العربیہ کی دوسری جلد پوری اسی عنوان پر لکھی ہے، جو سب سے بہتر، جامع اور دلکش تصنیف ہے۔ علی ہذا اقسام القرآن، امثال القرآن، متشابہات القرآن، مبہمات القرآن بلکہ آیات، الفاظ اور حروف قرآن کی تعداد وغیرہ تک کوئی عنوان ایسا نہیں ہے، جس پر تصنیفیں نہ ہوں۔ یہاں تک کہ خواص القرآن یعنی آیات سے تعویذات، عملیات اور نقوش وغیرہ پر بھی تمیمی، امام غزالی اور یافعی وغیرہ نے کتابیں لکھ ڈالی ہیں۔

قرآنی علوم پر یہ کتابیں مفسروں کے لئے کارآمد ذخیرہ ہیں جن سے وہ اپنی تفسیروں میں مدد لیتے ہیں۔

نقائص تفسیر

گذشتہ صفحات میں ان خرابیوں کی طرف جو تفسیروں میں واقع ہوئیں ضمناً اشارات کئے گئے ہیں۔ اب میں ان کے بڑے بڑے نقائص کو تفصیل وار بیان کر دیتا ہوں۔

(1) سب سے پہلا نقص یہ ہے کہ ان مفسرین نے قرآن کی تشریح کے اصول مقرر نہیں کئے۔ علماء اصول نے جو قواعد لکھے ہیں اول تو وہ مخصوص قرآن فہمی کو پیش نظر رکھ کر نہیں مرتب کئے گئے ہیں، بلکہ عام ہیں اور زیادہ تر ان کا تعلق الفاظ سے ہے، دوسرے ان کی بنا محض قیاس پر ہے جس میں ہر نقطہ پر اختلاف کی گنجائش اور غلطی کا احتمال ہے، تیسرے وہ صرف چند قاعدے ہیں جو بالکل ناکافی ہیں۔ زمانہ مابعد میں امام ابن تیمیہ نے جو ترجمان القرآن کے لقب سے مشہور تھے، اس ضرورت کو محسوس کر کے اصول لکھنے شروع کئے، مگر نامعلوم وجوہ سے صرف تمہید ہی لکھ کر رہ گئے آخری زمانہ میں شاہ ولی اللہ مرحوم دہلوی نے اصول تفسیر میں ایک رسالہ فوز الکبیر لکھا ہے، لیکن اس میں صرف بعض ایسے مطالب کی مختصر تشریحات ہیں، جن سے فہم قرآن میں مدد مل سکتی ہے، ان کو اصول نہیں کہا جا سکتا کیونکہ وہ محدود ضوابط نہیں ہیں، جن سے کوئی مخصوص طریقہ تفسیر کا متعین ہو سکے، بلکہ وہ شاہ صاحب کے فہم قرآن کی نوعیت کو ظاہر کرتی ہیں اور بس۔

الغرض تفسیر قرآن کے اصول قطعاً مرتب نہیں ہو سکے ہیں، حالانکہ سب سے پہلا کام یہی تھا، اس لئے یہ تمام تفاسیر جو لکھی گئی ہیں، کسی علمی یا عقلی اصول پر مبنی نہیں ہیں چنانچہ ایک ممتاز مفسر علامہ فناری کا قول نقل کر چکا ہوں کہ ''تفسیر کے لئے بجز چند معمولی قاعدوں کے اصول مطلقاً نہیں ہیں جن پر اس کی جزئیات کا مدار ہو۔'' (مرأۃ التفسیر صفحہ:8)

(2) ان مفسروں نے قرآن کی تفسیر کا جو طریقہ رکھا ہے، وہ وہی ہے جس کے مطابق کسی انسانی کتاب کی تشریح کی جاتی ہے، یعنی، فاتحہ سے شروع کر کے ایک ایک آیت کی سلسلہ وار تفسیر لکھتے چلے جاتے ہیں اور خاتمہ تک پہنچا دیتے ہیں۔ اس طرح آیات اور الفاظ کے معانی کی شرح تو ضرور

ہو جاتی ہے مگر قرآن سمجھ میں نہیں آتا' یعنی اس کی کوئی تعلیم حل نہیں ہوتی' اس لئے کہ اس کی تعلیمات اس ترتیب اور ربط کے ساتھ نہیں بیان کی گئی ہیں' جس طرح انسانوں کی کتابوں میں بیان کی جاتی ہیں' بلکہ اس کی ہر تعلیم متعدد سورتوں اور آیتوں میں اس کے طول وعرض میں بتدریج اتاری گئی ہے۔ تاوقتیکہ کسی خاص مسئلہ کے متعلق تمام تعلیمات متفرق سورتوں سے نکال کر جمع نہ کر لی جائیں اور ان کو صحیح ترتیب کے ساتھ مرتب نہ کیا جائے' اس مسئلہ کی پوری قرآنی تعلیم ہرگز سمجھ میں نہیں آ سکتی' لہٰذا ان تفسیروں نیز ترجموں سے جو سلسلہ بسلسلہ آیات کے ساتھ چلتے ہیں' قرآنی تعلیمات کی توضیح نہیں ہوسکتی۔ فہم قرآن کے لئے ان تفسیروں کی نوعیت تقریباً وہی ہے' جو فن طب میں کتب مفردات کی ہے جن میں حروف تہجی کی ترتیب کے ساتھ دواؤں کے نام خواص' آثار اور بدل وغیرہ لکھ دیئے جاتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ کوئی شخص ان کو پڑھ کر طبیب نہیں ہوسکتا۔ بجنسہٖ اسی طرح ان تفاسیر وتراجم کے مطالعہ سے بھی کوئی شخص حقائق قرآنی کا عالم نہیں ہوسکتا۔

(3) اکثر تفاسیر میں آیات و الفاظ کی تشریحات روایات سے کی گئی ہیں اور تفسیری روایات کی بابت ہم لکھ چکے ہیں کہ ان کا بڑا حصہ خود محدثین کے نزدیک موضوع ہے چنانچہ امام احمد بن حنبل نے جن کے اوپر حدیث کی امامت منتہی ہوئی کہہ دیا ہے کہ تفسیری روایتیں تمام تر بے اصل ہیں۔ قصص میں اسرائیلیات لائی جاتی ہیں جو بیشتر ناقابل اعتبار ہیں یہی حال اسباب نزول کی روایتوں کا ہے۔ قدیم مفسروں نے ان روایتوں کے سلسلۂ اسناد بھی لکھے تھے جن سے صحیح اور غیر صحیح کی تمیز ہوسکتی تھی۔ مگر متاخرین نے ان کو بھی حذف کر دیا اور اپنی تفسیروں میں ان روایات کو بلا اسناد کے نقل کرنے لگے' جس کے باعث عوام میں ان کی حیثیت مسلمات کی سی ہوگئی اور بہت سی آیتوں کی غلط تفسیریں امت میں رائج ہوگئیں۔ یہی سبب ہے کہ جس قدر تفاسیر کی کثرت ہوتی گئی اسی قدر مسلمانوں کو قرآن کریم کی اصلی اور صحیح تعلیم سے بعد ہوتا گیا۔

(4) ایک خاص شکایت یہ ہے کہ ان تفسیر نگاروں نے خود اپنے دماغوں سے بہت کم محنت لی ہے الا ماشاء اللہ زیادہ تر متقدمین ہی کی باتیں اور روایتیں نقل کرتے چلے آئے ہیں بعض بزرگ تو اس قسم کے گذرے ہیں' جنہوں نے اپنی تفسیریں محض ثواب کا ذخیرہ اور جنت کا ذریعہ سمجھ کر لکھی ہیں' یعنی تقرباً الی اللہ خدام قرآن میں داخل ہوگئے' بحالیکہ ان کی تفسیروں میں کوئی چیز ایسی نہیں ملتی' جس پر کسی طالب قرآن کی زبان سے ان کے لئے مغفرت کی دعا نکلے' یا جو بوجھ اپنی تصنیف کا وہ پڑھنے والوں پر ڈال گئے ہیں' اس کی کوئی تلافی ہو سکے۔ بیشتر اسی قسم کی تفسیریں تھیں' جو معدوم یا متروک ہو گئیں' کیونکہ یہ حقیقت ہے جس کو قرآن نے سکھلایا ہے کہ وَاَمَّا مَا یَنۡفَعُ النَّاسَ فَیَمۡکُثُ فِی الۡاَرۡضِ ؕ (13:17) وہی چیز دنیا میں رہے گی جو لوگوں کے لئے نفع رساں ہوگی۔

جن لوگوں نے دماغ سے کام لیا ہے' ان میں سے اکثر ایسے ہیں' جنہوں نے اپنے اپنے خاص خاص عقیدوں کو موقع بے موقع قرآن کے ذریعہ سے پیش کرنے کی کوشش کی ہے اور بعض نے محض جدت طبع دکھائی ہے' مثلاً ابن فورک نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے قول لیطمئن قلبی کی تفسیر میں

لکھا ہے کہ قلبی ان کے ایک دوست تھے، یا کطی السجل الکتب کی تفسیر میں بعضوں نے کہا ہے کہ سجل آنحضرت ﷺ کے کاتب کا نام تھا۔ حالانکہ تمام ائمہ حدیث و تاریخ متفق ہیں کہ اس نام کا کوئی صحابی نہیں ہے، یامرج البحرین کی تفسیر علی و فاطمہ اور لولو والمرجان کی تفسیر حسنین رضی اللہ عنہم، یاالصابرین والصادقین والقانتین والمنفقین والمستغفرین کی تفسیر میں صابر سے مراد رسول اللہ ﷺ، صادق سے صدیق رضی اللہ عنہ، قانت سے عمر فاروق رضی اللہ عنہ، منفقین سے عثمان غنی رضی اللہ عنہ اور مستغفرین سے حضرت علی رضی اللہ عنہ۔ غرض اسی طرح کی سینکڑوں آیات ہیں، جوان حضرات نے مسخ کی ہیں [1]۔

(5) یہ مفسرین بالعموم قرآن میں نسخ کے قائل ہیں، چنانچہ بہت سی محکم اور یقینی آیتوں پر بھی نسخ کے احکام لگاتے چلے جاتے ہیں، بلکہ جن لوگوں نے ناسخ اور منسوخ پر کتابیں لکھی ہیں، ان کی تو کوشش یہی معلوم ہوتی ہے کہ جس قدر ہو سکے نسخ دکھلائیں۔ ان کے بیان کے مطابق نصف بلکہ اس سے بھی زیادہ احکامی آیات منسوخ ہیں، غرض اس نسخ کے عقیدہ نے بھی تفسیروں کے اندر ایک عجیب پیچیدگی پیدا کر دی ہے۔

(6) یہ مفسرین بہت سی آیتوں کی تفسیر میں متعدد معانی اور مختلف اقوال نقل کرتے ہیں، مثلاً غیر المغضوب علیہم ولا الضالین کی تفسیر میں دس قول ہیں والفجر ولیال عشر کی متعدد تفسیریں ہیں وشاھد و مشھود کی شرح میں کئی باتیں کہی گئی ہیں اصحاب الاخدود کی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ وہ اہل فارس تھے یا یمن کے باشندے تھے یا حبشی یا نجرانی یا شامی تھے [2]۔ الغرض سینکڑوں الفاظ و آیات ہیں، جن کی کئی کئی تفسیریں یا، یا کر کے لکھتے چلے جاتے ہیں اور کسی ایک بات کو جزم و یقین کے ساتھ بیان نہیں کرتے۔ ان میں سے صحیح مفہوم کے فیصلہ کی قوت خود ان کے اندر مفقود ہوتی ہے، حالانکہ صحیح مفہوم ایک اور صرف ایک ہی ہوسکتا ہے۔ ایسی تفسیروں سے بجائے اس کے کہ آیات کی توضیح ہو، وہ اور مبہم ہو کے رہ جاتی ہیں۔

(7) ان مفسروں کو قرآنی حقائق کی جستجو کم اور غیر متعلق اور غیر ضروری باتوں کی تلاش زیادہ رہتی ہے۔ جنت کا ذکر ہے، تو اس کے پیالوں اور آبخوروں کی تعداد کا شمار اور کوثر اور طوبیٰ کی پیمائش کریں گے۔ دوزخ کے بیان میں اس کے طبقوں کی گہرائی اور سانپوں اور بچھوؤں کی درازی ناپیں گے۔ جنگ بدر میں فرشتوں کے نزول کی حقیقت سمجھانے کے بجائے ان کے چہروں، گھوڑوں اور عماموں کے رنگ اور ان کی سواری وحملہ وقتال کی کیفیت لکھیں گے۔ یاجوج و ماجوج کے تاریخی حالات بیان نہیں کریں گے، بلکہ کوئی لکھے گا کہ ان کے قد اس درخت سے مشابہ ہیں، جو ملک شام میں نظر آتا ہے اور جس کی بلندی ایک سو بیس گز ہوتی ہے اور کوئی لکھے گا کہ ان کا ایک کان اوڑھنا ہے اور دوسرا بچھونا۔ اگر ان چیزوں کا موقع نہیں پائیں گے تو فصاحت و بلاغت کی لطافتیں دکھلانے لگیں گے یا خیالی فلسفیانہ بحثوں میں الجھ جائیں گے۔

یہ سات بڑے بڑے عیوب و اسقام جو میں نے

[1] تذکرۃ الموضوعات [2] تفسیر جامع البیان

گنائے ہیں ان میں سے اکثر ایسے ہیں کہ موجودہ تفسیروں میں سے شاید ہی کوئی تفسیر ان سے خالی ہو۔ ان کے علاوہ اگر ان تفاسیر کی چھوٹی چھوٹی جزئی خرابیوں پر نظر ڈالی جائے تو وہ حدوشمار سے باہر ہیں۔

قرآن

یہ میں پہلے لکھ چکا ہوں کہ قرآن کامل اور مکمل کتاب اور دین کا مستقل دستور العمل ہے۔ وہ اس قدر واضح اور روشن ہے کہ اللہ نے اس کو نور مبین کہا ہے۔

وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكُمْ نُوْرًا مُّبِيْنًا (4:174)

اور ہم نے جگمگاتا نور تمہاری طرف اتارا۔

نور خود بھی روشن ہوتا ہے اور اردگرد کی چیزوں کو بھی روشن کر دیتا ہے۔ یہی حال قرآن کا ہے کہ وہ واضح۔ کھلا ہوا اور روشن ہے اور اپنے مطالب کی تشریح آپ کر دیتا ہے۔ اس کی تلاش کے لئے کسی دوسری روشنی کی ضرورت نہیں۔ جیسے آفتاب کو چراغ سے نہیں ڈھونڈھا جاتا۔ وہ دین و دنیا کے ان تمام حقائق کی جن سے انسان کو ہدایت ملتی ہے اور قدیمی آسمانی کتابوں کی تمام ابدی تعلیمات کی توضیح اور تفصیل اپنے اندر رکھتا ہے۔

وَنَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ وَهُدًى وَّرَحْمَةً وَّبُشْرٰى لِلْمُسْلِمِيْنَ ﴿٨٩﴾ (16:89)

اور ہم نے تجھ پر کتاب اتاری جو ہر شے کی تشریح اور مسلمانوں کے لئے ہدایت رحمت اور بشارت ہے۔

مَا كَانَ حَدِيْثًا يُّفْتَرٰى وَلٰكِنْ تَصْدِيْقَ الَّذِيْ بَيْنَ يَدَيْهِ وَتَفْصِيْلَ كُلِّ شَيْءٍ وَّهُدًى وَّرَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ (12:111)

یہ قرآن کوئی بنائی ہوئی بات نہیں ہے بلکہ اس میں پہلی کتابوں کی تصدیق اور ہر شے کی تفصیل ہے اور ان لوگوں کے لئے جو ایمان لائے ہیں ہدایت اور رحمت ہے۔

اللّٰهِ وَلٰكِنْ تَصْدِيْقَ الَّذِيْ بَيْنَ يَدَيْهِ وَتَفْصِيْلَ الْكِتٰبِ لَا رَيْبَ فِيْهِ مِنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿٣٧﴾ (10:37)

اور یہ قرآن ایسا نہیں ہے کہ اللہ کے سوا کوئی دوسرا اس کو بنالے بلکہ یہ اپنے سے پہلی کتابوں کی تصدیق کرتا ہے اور الکتاب کی تفصیل ہے اس میں کسی قسم کا شک نہیں ہے یہ رب العالمین کی طرف سے ہے۔

آیت بالا میں ''الکتاب'' سے مراد علم الٰہی ہے جس کو قرآن نے جابجا اسی لفظ سے تعبیر کیا ہے۔

اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا فِي السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ ؕ اِنَّ ذٰلِكَ فِيْ كِتٰبٍ ؕ (22:70)

کیا تو نہیں جانتا کہ اللہ ان سب چیزوں کا علم رکھتا ہے جو آسمان وزمین میں ہیں بیشک وہ لکھی ہوئی ہیں۔

اسی علم کو ''کتاب مبین'' فرمایا ہے۔

وَيَعْلَمُ مَا فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ ؕ وَمَا تَسْقُطُ مِنْ وَّرَقَةٍ اِلَّا يَعْلَمُهَا وَلَا حَبَّةٍ فِيْ ظُلُمٰتِ الْاَرْضِ وَلَا رَطْبٍ وَّلَا يَابِسٍ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ (6:59)

وہ جانتا ہے جو کچھ خشکی اور تری میں ہے اور کوئی پتہ نہیں گرتا مگر وہ اس کا علم رکھتا ہے اور زمین کی

تاریکیوں میں جو دانہ ہے اور جو کچھ خشک و تر ہے وہ سب کتاب مبین (علم الٰہی) میں ہے۔

اسی ''کتاب مبین'' کو اللہ نے عربی قرآن بنایا۔

وَالْكِتٰبِ الْمُبِيْنِ ۙ﴿۲﴾ اِنَّا جَعَلْنٰهُ قُرْءٰنًا عَرَبِيًّا لَّعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ۚ﴿۳﴾ وَاِنَّهٗ فِيْٓ اُمِّ الْكِتٰبِ لَدَيْنَا لَعَلِيٌّ حَكِيْمٌ ؕ﴿۴﴾ (43:2-4)

اور کتاب مبین شاہد ہے کہ ہم نے اس کو عربی قرآن بنایا تاکہ تم سمجھو اور وہ ہمارے پاس ام الکتاب میں بڑے رتبہ والا اور حکمت والا ہے۔

کتاب مبین صحیفۂ فطرت ہے اور ام الکتاب جو کتاب مبین پر شامل ہے صحیفۂ کائنات ہے جس کا دوسرا نام لوح محفوظ ہے۔ عالم فطرت فعل الٰہی ہے کتاب مبین علم الٰہی ہے اور قرآن کریم قول الٰہی ہے اور یہ تینوں متحد ہیں۔

جس طرح صحیفۂ فطرت کے حقائق کی وسعت بے پایاں ہے اسی طرح قرآنی حقائق کی بھی کوئی انتہا نہیں ہے اور انسانی نسلیں ابدالآباد تک بھی ان کو ختم نہیں کر سکتیں۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن ہمیشہ کے لئے بنی نوع انسان کی ہدایت کا نصاب مقرر کیا گیا ہے۔

مزید توضیح کے لئے یہاں یہ بیان کر دینا ضروری ہے کہ مصنوعات فطرت اور مصنوعات انسانی میں اس قدر بدیہی فرق ہے کہ ہر انسان بلا کسی قسم کے ریب اور شک کے ان دونوں میں امتیاز کر لیتا ہے۔ مثلاً زمین۔ دریا۔ اور پہاڑ اور جنگل کو دیکھ کر سب کو یقین کے ساتھ علم ہو جاتا ہے کہ یہ فطری چیزیں ہیں اور اگر زمین پر کوئی عمارت۔ یا پہاڑ میں کوئی بت یا دریا میں کوئی کشتی یا جنگل میں کوئی گاڑی نظر آئے تو ہر شخص بلا کسی اشتباہ کے سمجھ جاتا ہے کہ یہ انسانی ساخت ہے۔

درخت پر سے گرا ہوا پتہ۔ گھاس سے جھڑا ہوا ایک تنکا۔ چیونٹی کا ٹوٹا ہوا ایک پاؤں اور بھیڑ کا گرا ہوا ایک بال اگر سارے عالم کے ماہر اور کاریگر جمع ہو کر بھی بنانا چاہیں تو نہیں بنا سکتے۔ یہی فرق اللہ کے کلام اور انسان کے کلام میں ہے۔

قُلْ لَّئِنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ عَلٰٓى اَنْ يَّاْتُوْا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لَا يَاْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ وَلَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِيْرًا (17:88)

کہہ دے کہ اگر سارے جن وانس اس بات پر متفق ہوں کہ قرآن جیسا کلام بنائیں تو بھی ویسا نہیں بنا سکتے اگرچہ وہ سب ایک دوسرے کے مددگار کیوں نہ ہوں۔

لیکن معنوی حقائق چونکہ عقلی چیزیں ہیں اس لئے یہ فرق سر کی آنکھوں سے نظر نہیں آ سکتا بلکہ دل کی آنکھوں سے دیکھا جاتا ہے اور یہی امتیاز قرآن کا وہ زندہ معجزہ ہے جو جاودانی ہے اور اہل بصیرت پر سورج کی طرح نمایاں ہے جن لوگوں نے آیات الٰہی کا اقوال انسانی کے سامنے موازنہ کر کے اس کے اعجاز دکھانے کی کوشش کی ہے اللہ ہی جانتا ہے کہ وہ کس بے بصری میں مبتلا تھے۔

دوسرا فرق مصنوعات فطرت اور مصنوعات انسانی میں یہ ہے کہ فطرتی اشیاء کے منافع اور تاثیرات کی کوئی حد نہیں معین کی جا سکتی بلکہ ان کے متعلق جس قدر معلومات بڑھتی جاتی ہیں اس قدر ان کے افعال وخواص معلوم ہوتے جاتے ہیں۔ بخلاف انسانی مصنوعات کے جو ایک معین اور مخصوص غرض وغایت کے لئے بنائی جاتی ہیں اور ان سے وہی نفع لیا

جاتا ہے جس کو پہلے سے مدنظر رکھ کر وہ بنائی گئی ہیں۔ یہی کیفیت خالق اور مخلوق کے کلام کے مراتب کی ہے۔ قرآن اللہ کا کلام ہے وہ کسی ایک ماحول۔ ایک زبان یا ایک مکان کے لئے نہیں ہے بلکہ ہر ماحول ہر زبان اور ہر مکان کے لئے ہے حقائق فطرت کے متعلق جس قدر انسان کا علم بڑھتا جائے گا' اسی قدر قرآنی حقائق بھی اس کی سمجھ میں آتے جائیں گے اور قرآن بھی فطرتی اشیاء کی طرح کسی زمانہ میں ختم ہو جانے والا اور تھک جانے والا نہیں ہے۔ بخلاف انسانی اقوال کے کہ ان کے معانی محدود ہوتے ہیں اور ان کی غرض معین۔

جو لوگ یہ خیال رکھتے ہیں کہ عہد صحابہؓ مین قرآن بالکل سمجھ لیا گیا اور اب ہم کو انہی کی فہم پر قناعت کر لینا چاہئے وہ قرآن کی حقیقت سے آشنا نہیں ہیں۔ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم کا علم قرآنی اس لحاظ سے افضل ہے کہ انہوں نے اس کے عملی پہلو کو اختیار کیا اور جو کچھ سمجھا' یا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو سمجھایا اس کی پوری تعمیل کی اور حقیقت یہ ہے کہ قرآن صرف نظری کتاب نہیں ہے بلکہ عملی بھی ہے اور اس کی ہدایتوں پر عمل کرنے ہی سے فلاح نصیب ہوتی ہے۔ اس لئے صحابہ کا درجہ عملی لحاظ سے اس قدر افضل ہوا کہ ساری امت مل کر بھی ان کے رتبہ کو نہیں پہنچ سکتی۔ جو لوگ فہم قرآن کو ان روایات میں الجھانا چاہتے ہیں جو صحابہ کرامؓ سے مروی ہیں وہ اس حقیقت کو نظر انداز کر دیتے ہیں کہ قرآن کسی مخصوص ماحول کی کتاب نہیں ہے۔ اگر کسی ایک زمانہ میں وہ بالکل سمجھ لی گئی تو ختم ہو چکی اور آئندہ کے لئے نصاب نہیں رہی۔ لیکن وہ قیامت تک کے لئے دینی نصاب ہے اور ہر زمانہ میں نئی روشنی اس سے نکالی جا سکتی ہے۔ علاوہ بریں جیسا کہ ہم نے پہلے بیان کیا ہے یہ روایات جن ذرائع سے آئی ہیں وہ اس قدر غیر یقینی اور مشتبہ ہیں کہ قرآن جیسی قطعی اور یقینی چیز کی تشریح کا مدار ان کے اوپر رکھنا اس کی قطعیت کو کھونا ہے۔

یہ خیال بھی کہ اس زمانہ میں جب آیات نازل ہوئی تھیں لوگ ان کے شان نزول سے واقف تھے اس لئے انہوں نے اچھی طرح ان کو سمجھ لیا دراصل قرآن کے متعلق اسی غلط تصور کا نتیجہ ہے کہ وہی ایک ہی زمانہ کی چیز ہے۔ قرآن کسی شان نزول۔ موقع نزول یا واقعۂ نزول کا پابند نہیں ہے اور اس کی ہدایات مخصوص زمان و مکان سے قطعاً وابستہ نہیں ہیں بلکہ بالاتر ہیں۔ ہماری تمام تفسیریں آغاز عہد سے اب تک یعنی امام ابن جریر طبری سے مفتی محمد عبدہ تک اسی قدامت پرستی کے نظریہ کے ماتحت لکھی گئی ہیں اور ان کا انداز بھی شروع سے لے کر آج تک ایک ہی ہے یعنی وہ سلسلہ بسلسلہ آیات کے ساتھ ساتھ چلتی ہیں۔ اس طرح آیات اور الفاظ کی تشریح تو ضرور ہو جاتی ہے مگر قرآنی مسائل اور حقائق سمجھ میں نہیں آ سکتے۔ کیونکہ وہ مسلسل نہیں بیان کئے گئے ہیں بلکہ مختلف سورتوں اور آیتوں میں پھیلے ہوئے ہیں اس لئے قرآن فہمی کے لئے یہ تفسیریں زیادہ کارآمد نہیں ہیں۔ ان تمام تفسیروں کا مفید حصہ جو ہو سکتا ہے وہ تقریباً اسی قدر ہے جس کو راغب اصفہانی نے اپنی کتاب المفردات میں جمع کر دیا ہے۔ بقیہ جو کچھ ہے وہ سلف کی آیات فہمی کی تاریخ ہے اور بس۔ اس میں سے ہم صرف اسی قدر لے سکتے ہیں جو قرآنی تشریح کے مطابق نکل آئے۔

اصول قرآن:

اب ہم خود قرآن کریم ہی سے فہم قرآن کے وہ اصول بیان کرتے ہیں جو ہم نے اس سے اخذ کئے ہیں کیونکہ قرآن جیسا کہ ہم لکھ چکے ہیں مستقل کتاب ہے جو اپنی کسی بات میں بھی دوسری کسی چیز کی محتاج نہیں ہے۔ اسی لئے اللہ نے حکم دیا ہے کہ

اِتَّبِعُوْا مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَلَا تَتَّبِعُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَآءَ ؕ (7:3)

اس کی پیروی کرو جو تمہارے رب کی طرف سے تمہاری طرف اتارا گیا اور اس کے سوا اولیاء کی پیروی نہ کرو۔

(1)

قرآن فہمی کا اصل الاصول یہ ہے کہ اس کی بیان کی ہوئی جس حقیقت کی تفصیل مطلوب ہو وہ قرآن ہی سے نکالی جائے کیونکہ قرآن کی تفسیر اللہ نے اپنے ذمہ لی ہے۔

ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهٗ ﴿۱۹﴾ (75:19)

پھر اس کی تشریح بھی ہمارے ذمہ ہے۔

قرآن نے تصریح کر دی ہے کہ آیات قرآنی بیشتر محکمات ہیں۔ یعنی ان کے معانی قطعی اور متعین ہیں۔ تھوڑی سی متشابہات ہیں جن کے حقائق انسان کی علمی دسترس سے بالاتر ہیں مثلاً اللہ کی ذات، صفات، جنت، دوزخ اور میزان عمل وغیرہ جس کو تمثیل اور تشبیہہ کے طور پر قرآن میں بیان کیا گیا ہے اور جن کی اصل حقیقت سمجھنے سے انسان اس دنیا میں قاصر ہے۔ ان کے اوپر صرف ایمان کا مطالبہ ہے نہ کہ عمل کا۔ اس وجہ سے ان کی تفصیل مطلوب نہیں ہے البتہ محکم آیات جو ام الکتاب اور اصل قرآن کہی گئی ہیں ان کی تفصیلات اللہ ہی کی طرف سے کی گئی ہیں۔

كِتٰبٌ اُحْكِمَتْ اٰيٰتُهٗ ثُمَّ فُصِّلَتْ مِنْ لَّدُنْ حَكِيْمٍ خَبِيْرٍ ۙ﴿۱﴾ (11:1)

یہ (مکمل) کتاب ہے جس کی آیتیں محکم بنائی گئی ہیں پھر حکمت اور خبر رکھنے والے اللہ کی طرف سے ان کی تفصیل کی گئی ہے۔

یہ تفصیل علم کے ساتھ کی گئی ہے۔

وَلَقَدْ جِئْنٰهُمْ بِكِتٰبٍ فَصَّلْنٰهُ عَلٰى عِلْمٍ (7:52)

ہم ان کے پاس ایسی کتاب لائے جس کی تفصیل ہم نے علم کے ساتھ کی ہے۔

یہ تفصیل اہل علم وفہم کے لئے ہے۔

قَدْ فَصَّلْنَا الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ (6:97)

ہم نے آیات کی تفصیل ان لوگوں کے لئے کی ہے جو علم رکھتے ہیں۔

قَدْ فَصَّلْنَا الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّفْقَهُوْنَ (6:98)

ہم نے آیات کی تفصیل ان لوگوں کے لئے کی ہے جو فہم رکھتے ہیں۔

جس قدر انسان کا علم حقائق فطرت کے متعلق بڑھتا جائے گا اسی قدر وہ قرآنی تفصیلات زیادہ سمجھنے کے قابل ہو گا۔ اگر فہم معانی میں اختلافات واقع ہوں تو قرآن ان کو رفع کرنے کی پوری صلاحیت رکھتا ہے۔ جس طرح کہ امور فطرت کے محققین میں کبھی کبھی نظریوں کا اختلاف واقع ہو جاتا ہے لیکن مزید غور وفکر سے رفتہ رفتہ آخر کار وہ مٹ جاتا

ہے اور سب کے سب ایک حقیقت پر پہنچ کر متحد الخیال ہو جاتے ہیں۔

قرآنی آیات جو اکثر بہ تبدیل الفاظ وعبارات جا بجا الٹ پھیر کے بیان کی گئی ہیں ان میں ان کی تشریح مضمر ہے۔

وَ كَذٰلِكَ نُصَرِّفُ الْاٰيٰتِ وَلِيَقُوْلُوْا دَرَسْتَ وَلِنُبَيِّنَهٗ لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ (6:105)

اور اسی طرح ہم آیتوں کو پھیر پھیر کے لاتے ہیں تا کہ وہ کہہ دیں کہ تو نے پڑھ کر سنا دیا اور تا کہ ہم اہل علم کے لئے تشریح کر دیں۔

الغرض قرآن کریم کی تفصیل خود قرآن ہی میں ہے اور وہ مفصل کتاب ہے۔

وَّهُوَ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ اِلَيْكُمُ الْكِتٰبَ مُفَصَّلًا (6:115)

اور وہی اللہ ہے جس نے تمہاری طرف کتاب اتاری تفصیل شدہ۔

اس لئے تفسیر قرآنی کی صورت یہ ہے کہ جس طرح حقائق فطرت کے مفکرین اپنی علمی تحقیق کے لئے ایک خاص شعبہ کو جس میں ان کو مہارت ہوتی ہے مخصوص کر لیتے ہیں اسی طرح وہ لوگ جو علوم صحیحہ میں سے کسی علم کے ماہر ہوں قرآن کی ان مخصوص آیات کی تفصیل جو ان کے علم سے تعلق رکھتی ہیں اپنے ذمہ لیں اور ان پر علمی بصیرت کے ساتھ غور وفکر کریں۔ اس طرح پر قرآن کی تفصیل ہوتی جائے گی اور عالم فطرت کی طرح اس کے حقائق بھی آشکارا ہوتے جائیں گے۔ لیکن علم کے ساتھ اخلاص بھی ضروری ہے کہ اس کے بغیر قرآن سمجھ میں نہیں آ سکتا۔

بیشک قرآن سے نصیحت لینا اور اس پر عمل کرنا عوام کے لئے بھی سہل ہے جس طرح کہ عالم فطرت کی نعمتوں سے متمتع ہونا جاہلوں کے لئے بھی آسان ہے۔ مگر عالم فطرت پر غور کرنے والوں نے ہزار ہا چیزیں جو ایجاد کی ہیں وہ ان کی فہم سے بالاتر ہیں۔ اسی طرح قرآنی حکمت تک رسائی علوم صحیحہ کے ساتھ ہی ہو سکتی ہے۔

اس سے یہ امر واضح ہو گیا کہ قرآن کی موجودہ تفسیریں جو آج تک ہوئی ہیں ان سے صرف آیات کے معانی حل ہوتے ہیں اور یہ ضروری اور ابتدائی چیز ہے لیکن کسی قرآنی حقیقت کی توضیح کے لئے سارے قرآن کو چھاننا پڑے گا اور اس لحاظ سے ابھی تک قرآن پر بہت کم توجہ کی گئی ہے۔

(2)

آیات کی تشریح میں روایات سے مدد لی جا سکتی ہے لیکن روایات غیر یقینی اور ظنی [1] ہیں اس لئے ان پر تفسیر کا مدار نہیں رکھا جا سکتا۔ تاریخ تفسیر میں ہم امام احمد بن حنبل کا قول نقل کر چکے ہیں کہ ''تفسیری روایتیں بوجہ ضعف رواۃ کے بے اصل ہیں۔'' عام خیال یہ ہے کہ صحاح ستہ میں جو روایات ابواب التفسیر میں آئی ہیں وہ صحیح ہیں لیکن ان پر نظر ڈالنے سے معلوم ہو جاتا ہے کہ وہ بھی امام موصوف کے قول سے مستثنیٰ نہیں ہیں چنانچہ تفسیر بالروایت [2] کے نام سے ہم نے ایک مقالہ میں صحاح ستہ سے بہت سی مثالیں نکال کر پیش کر دی

---

[1] روایات کے ظنی اور غیر یقینی ہونے کا پورا پورا ثبوت ہم اپنے مقالہ (علم حدیث) میں دے چکے ہیں۔ جو ادارہ طلوع اسلام سے شائع کیا جا چکا ہے۔

[2] یہ مقالہ جداگانہ رسالہ البیان امرتسر سے شائع ہو چکا ہے۔

ہیں جو علم۔عقل اور قرآن کے خلاف ہیں اور ہرگز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیان کی ہوئی تفسیریں نہیں ہوسکتی۔

(3)

تفسیر بالروایت کی ایک شاخ اختلاف قرأت بھی ہے۔ یعنی مفسروں نے بعض آیات کے الفاظ میں شاذ قرأتوں سے اضافے کر لئے ہیں۔مثلاً

وَاِنۡ كَانَتۡ وَاحِدَةً فَلَهَا النِّصۡفُ ؕ وَلِاَبَوَيۡهِ لِكُلِّ وَاحِدٍ مِّنۡهُمَا السُّدُسُ (4:12)

یہاں اخ اور اخت کے الفاظ کو جو بلا قید بیان کئے گئے ہیں اخیافی بھائی بہن کے لئے مخصوص کیا گیا اس روایت کی بنیاد پر کہ بعض صحابہ کی قرأت میں "اخ اؤ اخت لام" مروی ہے۔اس وجہ سے فقہاء نے اخیافی بھائی بہن کو ذوی الفروض میں داخل کرلیا۔نتیجہ یہ ہوا کہ وراثت کے اصول میں بدیہی غلطیاں واقع ہوگئیں اور اخیافی بھائی بہنوں کی وجہ سے بعض صورتوں میں حقیقی بھائی بہن محروم ہونے لگے۔مثلاً

ہندہ مسئلہ 6

شوہر	ماں	دو اخیافی بھائی	دو حقیقی بھائی
3	1	2	محروم

یہ کیسے عقل جائز رکھ سکتی ہے کہ ماں اور باپ دونوں کی اولاد یعنی سگے بھائی تو محروم رہیں اور صرف ماں کی اولاد ترکہ لے لے جن کو ممکن ہے کہ غیر خاندان سے وہ لائی ہو۔کیا یہ کھلی ہوئی غلطی نہیں ہے جو قرآن کریم کے سر تھوپی جارہی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ آیت مذکورۂ بالا میں قرآن نے بہن اور بھائی کا حصہ ہی نہیں بیان کیا ہے بلکہ رجل و امرأۃ یعنی مذکر و مونث عہدی وارثوں کا حصہ ہے۔اس مسئلہ کو ہم نے تفصیل کے ساتھ اپنی عربی کتاب الوارثۃ فی الاسلام میں بیان کر دیا ہے جو جامعہ ملیہ کے طبع سے شائع ہوچکی ہے اس لئے شاذ قرأتیں قرآن میں اضافے ہیں جو کسی طرح تسلیم کے قابل نہیں کیونکہ قرآن کی حفاظت کا اللہ نے ذمہ لیا ہے اور وہ اس کے ایک ایک لفظ کا محافظ ہے۔ ہمارا ایمان اسی قرآن پر ہے جو بین الدفتین محفوظ ہے۔

(4)

قرآن کریم کے الفاظ جس حد تک لے چلیں اس سے آگے مطلق قدم نہ بڑھایا جائے کیونکہ قرآن کا ہر لفظ اپنی جگہ پر اپنے معنی کے لحاظ سے کامل اور مقصود کے مطابق ہے۔

وَتَمَّتۡ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدۡقًا وَّعَدۡلًا ؕ (6:115)

اور تیرے رب کے الفاظ سچائی اور (معنی کی) برابر کے لحاظ سے پورے ہیں۔

ان کلمات سے آگے بڑھنے میں قرآنی حدود سے تجاوز لازمی ہے جو بڑی غلطیوں کا موجب ہوسکتا ہے۔مثلاً

وَلَقَدۡ عَلِمۡنَا الۡمُسۡتَقۡدِمِيۡنَ مِنۡكُمۡ وَلَقَدۡ عَلِمۡنَا الۡمُسۡتَاۡخِرِيۡنَ ﴿۲۴﴾ وَاِنَّ رَبَّكَ هُوَ يَحۡشُرُهُمۡ ؕ (15:24-25)

ہم کو تم میں سے آگے جانے والوں کا بھی علم ہے اور پیچھے آنے والوں کا بھی علم ہے۔ بے شک تیرا رب ان کو حشر میں جمع کرے گا۔

مستقدم اور مستاخر کے الفاظ قرآن میں کئی جگہ پہلے اور پیچھے مرنے والوں کے لئے مستعمل ہوئے ہیں۔مثلاً

اِذَا جَآءَ اَجَلُهُمۡ فَلَا يَسۡتَاۡخِرُوۡنَ سَاعَةً وَّلَا

يَسْتَقْدِمُوْنَ (10:49)

جب ان کی اجل آ جائے گی تو ایک گھڑی نہ وہ پیچھے رہیں گے نہ آگے بڑھیں گے۔

یعنی اپنے وقت معینہ پر ان کی ہلاکت واقع ہو جائے گی۔ اس لئے قرآن کی تفصیل کے مطابق ''ولقد علمنا المستقدمین ال آ ہ'' کے معنی یہ ہوئے کہ تم میں سے جو لوگ پہلے گزر گئے اور جو بعد میں مریں گے ان سب کا ہم علم رکھتے ہیں اور حشر کے دن ان سب کو جمع کریں گے۔ لیکن بعضوں نے اس آیت کی تفسیر یہ کی ہے کہ ایک حسین عورت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے نماز جماعت پڑھنے کے لئے مسجد میں آیا کرتی تھی۔ کچھ لوگ آگے کی صف میں بڑھ جاتے تھے تاکہ اس کو نہ دیکھیں اور کچھ پیچھے کی صف میں رہ جاتے تھے اور رکوع کی حالت میں بغل میں سے اس کی طرف جھانکتے تھے۔ انہیں کے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی۔

اب یہ معنی نکالنے کے لئے آیت میں پہلی صف اور پچھلی صف کے الفاظ کا اضافہ کرنا پڑتا ہے جو اصولاً جائز نہیں اور پھر صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی ایک جماعت پر ایسا مکروہ الزام عائد ہوتا ہے جس کو کوئی شخص جو ان کے حالات سے واقف ہے تسلیم نہیں کر سکتا۔ اگرچہ یہ روایت صحاح ستہ کی تین کتابوں ترمذی، نسائی اور ابن ماجہ میں درج ہے لیکن خود قرآنی تفصیل کی مخالف ہونے کی وجہ سے قابل قبول نہیں ہے۔

(5)

جہاں تک زبان کا تعلق ہے قرآن کی عربی آسان اور واضح ہے جس میں کوئی پیچیدگی نہیں۔

بِلِسَانٍ عَرَبِيٍّ مُّبِيْنٍ (26:195)

واضح عربی زبان میں:

قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا غَيْرَ ذِيْ عِوَجٍ (39:28)

عربی قرآن میں جس میں کوئی کجی نہیں۔

فَاِنَّمَا يَسَّرْنٰهُ بِلِسَانِكَ (44:58)

ہم نے اس (قرآن) کو تمہاری زبان میں آسان کر دیا ہے۔

لہٰذا الفاظ قرآن کے معانی وہی لئے جائیں گے جو عربی زبان کے مطابق صحیح ہوں اہل لغت نے جو معانی الفاظ کے لکھے ہیں ان کی بنیاد سماع پر ہے اور کتب لغت کی تدوین جس وقت ہوئی ہے اس وقت تک بہت سے الفاظ کے معانی تفسیر و حدیث و فقہ میں رائج ہو چکے تھے وہی لغات میں درج ہوئے اس لئے لغت مسلم ہے مگر وہ حتمی دلیل نہیں ہے قرآنی الفاظ کے معانی میں اگر اختلاف واقع ہو تو خود قرآن سے ان کا تعین ہو سکتا ہے۔

اصول و قواعد لسانی کی ترتیب بھی نزول قرآن کے مدتوں بعد ہوئی ہے بلکہ ان کا بڑا حصہ ائمہ فن نے خود قرآن ہی سے استنباط کیا ہے لہٰذا یہ اصول قرآن پر حاکم نہیں ہو سکتے۔ اگر کوئی بات قرآن میں ان اصول کے خلاف ہو تو سمجھنا چاہئے کہ جن لوگوں نے اصول استنباط کئے ان سے کمی رہ گئی ہے۔

(6)

ایک اہم اصول قرآن فہمی کا یہ ہے کہ اس کی تعلیمات میں اختلاف نہیں ہے۔

وَلَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِيْهِ اخْتِلَافًا كَثِيْرًا (4:82)

اور اگر یہ قرآن اللہ کے سوا کسی غیر کی طرف سے ہوتا تو لوگ اس میں بہت اختلاف پاتے

اس لئے کسی آیت کی ایسی تفسیر نہیں کی جا سکتی جو دوسری آیت کے خلاف پڑتی ہو۔ مثلاً

وَيَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَضُرُّهُمْ وَلَا يَنْفَعُهُمْ وَيَقُوْلُوْنَ هٰٓؤُلَآءِ شُفَعَآؤُنَا عِنْدَ اللّٰهِ ۭ قُلْ اَتُنَبِّئُوْنَ اللّٰهَ بِمَا لَا يَعْلَمُ فِي السَّمٰوٰتِ وَلَا فِي الْاَرْضِ ۭ (10:18)

عام مفسروں نے آیت بالا میں ''لَا يَعْلَمُ'' کا فاعل اللہ کو قرار دیا ہے یعنی اللہ کی طرف لاعلمی منسوب کی ہے۔ شاہ عبدالقادرؒ نے بھی اس کا ترجمہ یہ کیا ہے۔

اور پوجتے ہیں اللہ سے نیچے جو چیز نہ برا کرے نہ ان کا بھلا کرے اور کہتے ہیں کہ یہ ہمارے سفارشی ہیں اللہ کے پاس۔ تو کہہ کہ تم اللہ کو جتاتے ہو جو اس کو معلوم نہیں کہیں آسمانوں میں نہ زمینوں میں۔

یہ تفسیر یا ترجمہ علاوہ اس کے کہ جسارت ہے جو کسی مسلمان کے لئے زیبا نہیں براہ راست خود قرآنی تصریح کے خلاف ہے۔ قرآن میں ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ مِنْ شَيْءٍ ۭ (29:42)

جس شے کو بھی وہ اللہ کے ماسوا پکارتے ہیں اللہ اس کو جانتا ہے۔

پھر یہ مشرکین اللہ کو اپنے باطل معبودوں کی خبر ہرگز نہیں دیتے بلکہ ان کے توسط خود اپنی حاجتوں کی خبر اللہ تک پہنچانا چاہتے ہیں اور یہی معنی سفارشی بنانے کے ہیں۔ ورنہ اگر وہ اللہ کو اپنے معبودوں کی خبر دیتے تو خود اپنا حال بھی اس سے کہہ سکتے بیچ میں سفارشی کی کیا ضرورت تھی۔ اس آیت کا صحیح ترجمہ یہ ہے۔

اور وہ اللہ کے سوا ان کی پرستش کرتے ہیں جو نہ ان کو ضرر پہنچا سکتے ہیں نہ نفع اور کہتے ہیں کہ یہ لوگ اللہ کے پاس ہمارے سفارشی ہیں۔ کہہ دے کہ کیا تم اللہ کو ان کے ذریعہ سے خبر پہنچاتے ہو جن کو آسمان اور زمین کی کسی شے کا علم نہیں ہے۔

(7)

پہلے یہ اشارہ گزر چکا ہے کہ قرآن کی تفسیر میں نسخ کے عقیدہ نے بہت خرابیاں پیدا کی ہیں۔ مفسرین تین قسم کے نسخ کے قائل ہیں۔

(1) وہ آیات جن کا حکم بھی منسوخ ہو گیا اور وہ پڑھی لکھی بھی نہیں جاتیں۔

یہ خیال چند نہایت ضعیف بلکہ موضوع روایات سے پیدا ہوا۔ جن کو اکثر ائمہ حدیث خاص کر قاضی ابوبکر نے موضوعات کی فہرست میں شمار کیا ہے۔ اب چونکہ وہ آیتیں موجود نہیں نہ ان کے احکام باقی ہیں اس لئے ان پر بحث بھی غیر ضروری ہے۔

(2) وہ آیات جن کا حکم نہیں منسوخ ہوا لیکن تلاوت منسوخ ہو گئی۔

نسخ کی یہ قسم عقل کے بالکل خلاف ہے۔ کیونکہ اگر حقیقت میں ایسی کوئی آیت ہوتی تو ناممکن تھا کہ اللہ اس کی حفاظت نہ کرتا۔

مثال میں آیت رجم پیش کی جاتی ہے حالانکہ اگر واقعی

آیت رجم نازل ہوئی ہوتی تو کوئی وجہ نہ تھی کہ قرآن میں درج ہونے سے رہ جاتی۔ خود حضرت عمرؓ جن سے یہ روایت کی گئی ہے جمع قرآن میں شریک تھے۔ کیا چیز مانع تھی کہ انہوں نے اس کو نہ لکھوایا۔ علاوہ بریں چونکہ یہ روایت قرآن کی تصریح انا له لحافظون کے خلاف ہے اس لئے ہرگز تسلیم کے قابل نہیں ہے خواہ اس کے راوی جبرئیل و میکائیل ہی کیوں نہ بتائے جائیں۔

(3) وہ آیات جن کا حکم منسوخ ہو گیا ہے مگر تلاوت منسوخ نہیں ہوئی۔

اس قسم سوم میں لوگوں نے رائے اور قیاس کو اس قدر دخل دیا ہے کہ پچاسوں آیتوں پر نسخ کا حکم لگا دیا۔ علامہ ابن العربی نے اس تعداد کو کم کر کے 21 آیتوں کو منسوخ قرار دیا۔ شاہ ولی اللہ صاحب نے ان میں ذرا اور غور کیا تو ان کے نزدیک صرف پانچ آیتیں منسوخ ثابت ہوئیں۔ ہمارے نزدیک وہ بھی منسوخ نہیں جیسا کہ ہم نے دلائل کے ساتھ اپنی کتاب تاریخ القرآن میں لکھ دیا ہے جو علی گڑھ سے شائع ہو چکی ہے ان باتوں سے یہ صاف اندازہ ہو جاتا ہے کہ آیات کو جن لوگوں نے منسوخ کہا ہے محض اپنی رائے اور قیاس سے کہا ہے اور اللہ کا کلام اس سے کہیں بالاتر ہے کہ وہ کسی انسان کی رائے سے منسوخ ہو سکے۔ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ حق حاصل نہ تھا کہ وہ قرآن کے ایک لفظ کو بھی بدل سکیں۔

قُلْ مَا يَكُوْنُ لِيْٓ اَنْ اُبَدِّلَهٗ مِنْ تِلْقَآيِ نَفْسِيْ ۚ (10:15)

کہہ دے کہ مجھے حق نہیں ہے کہ اس کو بدلوں اپنی طرف سے۔

ان آیات کے متعلق جن کو لوگوں نے منسوخ الحکم قرار دیا ہے ہم کو یہ یقین ہے کہ وہ قرآن کی احکامی آیتیں ہیں اللہ نے ان کو نازل فرمایا ہے اور رسولؐ نے ان کو یاد کرایا اور قرآن میں لکھوایا ہے اب سوائے اللہ کے دوسرا کون اس کو منسوخ کر سکتا ہے۔ اگر کسی کو دو آیتوں میں باہمی تعارض نظر آتا ہے جس کی وجہ سے وہ ایک کو منسوخ قرار دیتا ہے تو یہ اس کی فہم کا قصور ہے۔ کیونکہ قرآن نے تصریح کی ہے کہ اس کی تعلیمات میں اختلاف نہیں ہے۔

قرآن کی آیات میں سے ایک بھی منسوخ نہیں ہے۔ جن لوگوں نے روایات سے آیات کو منسوخ قرار دیا ہے انہوں نے قرآن پر بڑا ظلم کیا ہے۔ مثلاً

كُتِبَ عَلَيْكُمْ اِذَا حَضَرَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ اِنْ تَرَكَ خَيْرَا ۖ الْوَصِيَّةُ لِلْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ بِالْمَعْرُوْفِ ۚ حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِيْنَ ۝ (2:180)

تمہارے اوپر فرض کیا گیا کہ تم میں سے جب کسی کی موت کا وقت آئے اگر کچھ مال چھوڑے تو والدین اور اقربا کے لئے وصیت کر جائے یہ اللہ سے ڈرنے والوں پر ایک حق ہے۔

صریح الفاظ میں اللہ نے مالداروں پر ورثہ کے لئے وصیت فرض کی اور متقیوں پر اس کو لازمی قرار دے کر موکد فرمایا۔ پھر آیت وراثت میں بھی تین جگہ ''من بعد وصیة'' فرما کر توضیح کر دی کہ توریث کا اجراء وصیت کے نفاذ کے بعد ہوگا۔ مگر فقہا نے ''الا لا وصیة لوارث'' (یاد رکھو وارث

کے لئے وصیت نہیں ہے) کی روایت سے اس موکد آیت کو منسوخ کر ڈالا اور یہ سمجھ نہ سکے کہ وصیت ورثہ کی شخصی مصلحتوں کے لئے ہے جو توریت میں ممکن نہیں۔ کیونکہ ورثہ کے حالات مختلف ہوتے ہیں۔ فرض کرو کہ ایک شخص کے دو بیٹے ہیں جن میں سے ایک پر اس نے ہزاروں روپیہ خرچ کیا ہے اور اس کو پڑھا لکھا کر اس قابل بنا دیا ہے کہ وہ خوب کماتا ہے اور باپ کی دولت سے مستغنی ہے۔ دوسرا بیٹا آج پیدا ہوا ہے۔ وراثت کا قانون کلی ہے وہ شخصی مصالح کا لحاظ نہیں کرے گا اور دونوں کو برابر دے گا لیکن مصالح فائلی کا تقاضا اس کے خلاف ہے۔ اس قسم کے مخصوص حالات کے لئے وصیت فرض کی گئی ہے تا کہ مورث اپنے ورثہ کی مناسب ضرورتوں کا لحاظ رکھ سکے۔

ایسی ضروری اور موکد آیت کو لوگوں نے صرف خبرِ احاد کی بنا پر منسوخ کر ڈالا اور قرآن کی سکھائی ہوئی مصلحت کو ضائع کر دیا[1]۔

خاتمہ:

یہ ہیں وہ چند موٹے موٹے اصول جو ہم نے قرآن سے اخذ کئے ہیں۔ ان کے علاوہ ضرورت پڑنے پر اور بھی اصول نکالے جا سکتے ہیں۔ ان اصول کے مطابق قرآن کریم کی تعلیمات کی تشریح عنوانات متعین کر کے ہی کی جا سکتی ہے اور ہم نے اپنا اصول یہی رکھا ہے اس انداز سے سب سے پہلی کتاب جو لکھی گئی وہ میری تصنیف تعلیمات قرآن ہے جو دہلی سے شائع کی گئی ہے۔ اس میں صرف چھ مسائل کی توضیح ہے جو اصول اسلام اور عقائد سے تعلق رکھتے ہیں۔

اب میرے مخلص رفیق چودھری غلام احمد خاں پرویز بی۔ اے جن کو اللہ نے قرآن فہمی کی توفیق عطا فرمائی ہے اسی نہج پر اپنی کتاب معارف القرآن پیش کر رہے ہیں۔ مجھے امید ہے کہ ناظرین کے لئے نہ صرف یہ کہ یہ کتاب مفید ثابت ہو گی بلکہ ان کے اوپر اس حقیقت کو بھی واضح کر دے گی کہ قرآنی حقائق کو قرآن ہی سے سمجھنے کا طریقہ محفوظ اور صحیح ہے اور ان کے دل کو اطمینان بخشے گی کہ جو کچھ انہوں نے سمجھا وہ قرآن ہی کی تعلیم ہے نہ کہ انسانی خیالات۔ کیونکہ کسی خاص خیال کو لیکر قرآن میں گھسنا اور اس کی آیات کو اس کے مطابق موڑنا خالص الحاد ہے جس کی سزا جہنم ہے۔

اِنَّ الَّذِیۡنَ یُلۡحِدُوۡنَ فِیۡۤ اٰیٰتِنَا لَا یَخۡفَوۡنَ عَلَیۡنَا ؕ اَفَمَنۡ یُّلۡقٰی فِی النَّارِ خَیۡرٌ اَمۡ مَّنۡ یَّاۡتِیۡۤ اٰمِنًا یَّوۡمَ الۡقِیٰمَۃِ ؕ (41:40)

جو لوگ ہماری آیتوں میں کجی اختیار کرتے ہیں وہ ہم سے چھپے ہوئے نہیں ہیں کیا جو آگ میں ڈالا جائے بہتر ہے یا جو قیامت کے دن بے خوف ہو کر آئے۔

اس کتاب کی مزید کیفیت آپ کو خود چودھری صاحب موصوف کے تعارف سے معلوم ہو گی۔ انہوں نے جس محنت اور خلوص سے اس کو لکھا ہے اس سے مجھے امید ہے کہ اللہ ان کی کوشش کو مقبول اور ان کی سعی کو مشکور فرمائے گا۔ آمین۔

---

[1] جناب علامہ نے اس مقدمہ میں مختلف اہم امور کا اجمالی ذکر فرمایا ہے۔ (اور مقدمہ میں تفصیلات کی گنجائش بھی نہیں ہوا کرتی) ان امور کی تفصیل معارف القرآن کے مختلف مقامات میں آجائے گی۔ انشاءاللہ العزیز۔ پرویز

آصف جلیل، لاہور

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مصنوعی ذہانت اور وحی

جب سے انسان کو سوچنے سمجھنے کی صلاحیت ملی ہے اور جب بھی اس نے اپنی عقل کا استعمال کیا ہے تو اس کے پیش نظر اپنا مفاد ہی ہوتا ہے۔ اس کے لئے اس نے ہر حربہ اختیار کیا ہے۔ جس حد تک طاقت کا استعمال ممکن ہوا اس نے گریز نہیں کیا اور جب ظلم کرنے پر آیا تو لاکھوں انسانوں کا خون بہا دیا۔ تمام وسائل رزق و پیداوار زمین سے نکلتے ہیں اور اسی کے حصول کے لئے شروع میں انفرادی طور پر پھر گروہوں نے اور پھر ممالک نے زمین کے ٹکڑے کر کے طاقت کے بل پر قبضہ کیا، جنگیں لڑی گئیں، کئی ملک صفحہ ہستی سے مٹ گئے اور کئی نئے وجود میں آئے۔ یہ سب اس بات کی شہادت ہیں کہ محض عقل سوائے فساد برپا کرنے کے اور کچھ نہیں کر سکتی۔ اس لئے اللہ تعالیٰ کی طرف سے وقتاً فوقتاً ہدایت آتی رہی ہے تا آنکہ اب آخری اور مکمل شکل میں اسے قرآن کریم میں محفوظ کر دیا گیا ہے۔

انسان کے سامنے اگر وحی نہ ہو تو اس کی عقل اور خواہشات اپنے مفاد تک محدود رہتی ہیں۔ غیر مسلموں کے سامنے قرآن کریم کو ایک مذہبی کتاب کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔ مروجہ اسلام کو مذہب کے طور پر مانا اور سمجھا جاتا ہے اور اسی کی تبلیغ کی جاتی ہے۔ انسانوں کی بڑی اکثریت یہی سمجھنے لگی ہے کہ اسے مذہب کی ضرورت اس لئے نہیں ہے کہ یہ مسائل حل کرنے کی بجائے ان میں مزید اضافہ کرتا ہے۔ یہ عقل و شعور کا دشمن ہے۔ مسلمانوں میں اسی طرح کے خیالات انہیں الحاد کی طرف لے جاتے ہیں۔ انہیں مذہبی راہنماؤں سے تسلی بخش جوابات نہیں ملتے، لیکن وہ اپنے طور پر قرآن کریم کو سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے اور جو کچھ انہیں مذہبی راہنماؤں سے ملتا ہے اسی کو حقیقی اسلام سمجھتے ہیں اور قرآن کے بارے میں وہی صحیح جانتے ہیں جو انہیں یہ لوگ بتاتے ہیں۔

جب صنعتی انقلاب آیا اور ترقی کا ایک دور شروع ہوا جس میں لوگوں کے لئے بے شمار آسانیاں میسر آئیں۔ سفر کی سہولتیں، صحت اور علاج، گھریلو استعمال کی اشیاء، انٹرٹینمنٹ اور جب سے انٹرنیٹ آیا ہے تو گویا ساری دنیا آپ کے سامنے عیاں ہو کر آ گئی ہے۔ چونکہ یہ سب کچھ غیر مسلموں کے ہاتھوں سے بنائے ہوئے کرشمات ہیں، مذہبی لوگوں نے ہر شے کی پہلے بھرپور مخالفت کی اور اسے حرام قرار دے کر اس کے استعمال سے روکا۔ پھر کچھ عرصہ بعد عقل مند لوگوں نے مخالفت کے باوجود

ان کا استعمال شروع کر دیا اور اس کے کچھ عرصہ بعد ان کے بغیر مذہبی راہنماؤں کا بھی گزارہ نہیں ہوتا۔

اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ مروجہ اسلام میں سوچنے کو گمراہی سمجھا جاتا ہے۔ اکثریت خود قرآن کو سمجھنے کی کوشش کرنے کی بجائے اپنے اپنے پسندیدہ مذہبی راہنماؤں کی باتوں کو حرف آخر سمجھتے ہیں چاہے وہ کتنی ہی مضحکہ خیز کیوں نہ ہوں۔ یہ لوگ سائنس کے نام سے چڑ جاتے ہیں اور اسے گمراہ کن سمجھتے ہیں اور برملا اس کی مخالفت کرتے ہیں۔ انہیں کون سمجھائے کہ سائنس ہے کیا؟ کائنات میں اللہ تعالیٰ کے جو اٹل قوانین کارفرما ہیں ان کا علم حاصل کر کے ان کے مطابق ان سے زندگی کے ہر شعبہ میں ایسی اشیاء بنانا جو بذات خود اچھی ہیں نہ بری۔ ان کا استعمال صحیح یا غلط، مفید یا نقصان دہ، آرام دہ یا تکلیف دہ ہوتا ہے۔ یہ سب انسانوں پر منحصر ہے۔ اگر قرآن کریم کو سمجھ کر پڑھا ہوتا تو یہ معلوم ہوتا کہ اللہ تعالیٰ نے تمام کائنات پر غور کرنے کا کہا ہے اور کہا ہے انسان اس کو مسخر کر سکتا ہے۔ جو یہ کام سرانجام دیتے ہیں انہیں علماء کہا ہے۔ افسوس تو یہ ہے کہ مسلمان اس معاملے میں بہت پیچھے ہیں اور تمام تر ایجادات غیر مسلموں نے کی ہیں، اس لئے ملائیت اس کے خلاف ہے۔ اس کی وجہ یہ بھی ہے کہ اس سے ان کے بہت سے تصورات بھی غلط ثابت ہو رہے ہیں۔ آج علم کے ذرائع عام ہو گئے ہیں اور نوجوانوں کے ذہن ایسی باتوں کو قبول نہیں کرتے۔

یہ امر بھی غور طلب ہے جہاں بہت سی اشیاء نے انسانوں کی زندگی میں آسانیاں پیدا کی ہے وہاں ایسی اشیاء بھی بنائی جاتی ہیں جن کا مقصد منفی ہے۔ اسلحہ سازی کا مقصد طاقت کے بل پر رزق کے وسائل پر اپنا تسلط قائم کرنا ہوتا ہے۔ آج کل اپنے ملک کے مفادات کی خاطر دوسرے ممالک پر اگر قبضہ نہیں کیا جاتا تو انہیں اپنے تابع کر کے دھونس کے ذریعے اپنا مفاد حاصل کیا جاتا ہے۔ ہتھیاروں کی ترقیاتی شکل بہت بڑی تباہی کا باعث بن سکتی ہے۔ ایک لمحے میں لاکھوں انسان موت کی آغوش میں چلے جاتے ہیں۔ عالمی جنگوں کے علاوہ پچھلی کئی دہائیوں میں کروڑوں لوگ ہلاک ہو چکے ہیں۔ یہ سب اسی لئے ہے کہ انسان اگر محض اپنی عقل کے تحت سوچے گا تو وہ اپنا مفاد ہی سوچے گا، اپنے ملک، اپنے قبیلہ کے مفاد کی خاطر اس حد تک جا سکتے ہیں کہ عورتیں اور بچے بھی محفوظ نہیں۔ ہسپتال، اسکول، رہائشی علاقے حتی کہ عارضی پناہ گاہیں بھی محفوظ نہیں۔ کئی دہائیوں سے اور خاص طور پر کچھ سالوں سے غزہ میں جو کچھ ہو رہا ہے اس بات کا ثبوت ہے کہ اگر وحی کی اقدار سامنے نہ ہوں تو انسان کس حد تک گر سکتا ہے۔

انٹرنیٹ اور موبائیل تقریباً ہر شخص کی دسترس میں آ گیا ہے۔ چھوٹے بچوں اور اسکول جانے والوں کے ہاتھ میں تھما دیا جاتا ہے جس کے نقصانات بہت زیادہ ہیں اگر ان کی تربیت اور نگرانی نہ کی جائے۔ جہاں اکثریت اللہ کی وحی سے ناآشنا ہوتی ہے وہاں شر بہت تیزی سے بڑھتا ہے۔ جو بھی نئی شے سامنے آتی ہے فوراً اس کا غلط استعمال بھی شروع ہو جاتا ہے۔ موبائیل فون سے دھوکہ دہی اور فراڈ کرنا بہت آسان ہو گیا ہے کیونکہ اکثریت اس سے واقف نہیں ہے اور نہ ہی بچنے کے لئے احتیاطی تدابیر کی جاتی ہیں۔ اس کے لئے لالچ ایک ایسا جال ہے جس میں لوگ بآسانی پھنس جاتے ہیں۔ انٹرنیٹ پر بھی نت نئے

طریقوں سے لوٹنے کی تدابیر کی جاتی ہیں۔

یہ سب کہنے کے بعد اصل موضوع کی طرف آتا ہوں۔ آج کل ہر طرف مصنوعی ذہانت کا چرچا ہے۔ ابھی لوگ اس کے بارے میں اچھی طرح جان نہیں پائے کہ اس کا غلط استعمال عام ہو گیا ہے۔ کچھ ملکوں میں اس بارے میں تشویش کا اظہار کیا گیا تھا لیکن اس کی روک تھام کے لئے مناسب اقدامات نہیں کئے گئے۔ جعلی نوٹوں کی طرح اصلی، نقلی کی پہچان مشکل ہو گئی ہے۔ سب سے زیادہ پریشانی کی بات یہ ہے کہ شک کی فضا پیدا ہو گئی ہے۔ اکثر واٹس ایپ گروپوں میں شیئر کی جانے والی ویڈیوز کے بارے میں لوگ پوچھ رہے ہوتے ہیں کہ کیا یہ اصلی ہے یا نقلی؟ ممالک کے سربراہوں اور مشہور شخصیات کی تصاویر کو اسطرح بنا کر ان کی طرف جھوٹا بیان منسوب کیا جاتا ہے کہ پہچاننا مشکل ہوتا ہے۔ ویڈیوز میں ان کی شکل اور آواز میں بے حد مماثلت ہوتی ہے لیکن الفاظ ان کے نہیں ہوتے۔ عام آدمی اسے اصل سمجھ کر خوب پھیلا دیتا ہے۔ اسی طرح کسی گھر کے فرد کی آوازیں ریکارڈ کر کے تاوان لینے کے لئے استعمال میں لانے کے واقعات ہوئے ہیں۔

ان تمام باتوں کا مقصد یہ ہے کہ وحی کے بغیر کبھی بھی خوف اور حزن سے نجات نہیں مل سکتی۔ انسانوں کے بنائے ہوئے نظاموں میں بے شمار مسائل ہیں، غیر مسلموں کے نسبتاً کم لیکن نام نہاد مسلم ریاستوں کے نظام میں ابتری، پریشانیاں، طبقاتی نظام، دوہرے معیار غرض ہر طرح کی خرابیاں ہیں۔ جب تک انسان وحی سے راہنمائی نہیں لیں گے مسائل کا حقیقی حل نہیں ملے گا کیونکہ انسانی عقل ذاتی مفاد کی طرف رہنمائی کرتی ہے جس سے مسائل کا حل نکلنے کی بجائے مسائل بڑھنے کے ساتھ ساتھ بے یقینی کی فضا قائم ہو چکی ہے۔ افواہوں کا دور دورہ ہے ہر شخص غلط اطلاعات پا کر بلاوجہ پریشان ہو جاتا ہے۔ جہنم کے لئے اس سے بہتر مثال کیا دی جا سکتی ہے؟

جن لوگوں تک قرآن کی راہنمائی پہنچ چکی ہے، انہیں ہر وقت محتاط رہنے کی ضرورت ہے کہ مصنوعی ذہانت کے منفی استعمال سے بچ سکیں۔ کسی بھی موصول ہونے والے پیغام پر غور کئے بغیر نہ تو کسی لنک پر کلک کریں اور نہ ہی کسی کو کوڈ مہیا کریں۔ اس دنیا میں کوئی شے مفت نہیں ہے، یہ دراصل کسی فراڈ کی طرف لے جانے والا خوشنما راستہ ہے۔ یہ مثل صادق آتی ہے کہ لالچ بری بلا ہے۔ اس دور میں تقویٰ اختیار کرنا نہایت ضروری ہے جس کے لئے قرآن کریم میں ذکر اللہ کی ہدایت پر عمل کرنے سے ہی انسان متقی بنتا ہے۔ اس کے علاوہ دنیا میں ہونے والے واقعات پر گہری نظر رکھنا بھی لازمی ہے۔ یعنی عقل اور وحی دونوں لازم و ملزوم ہیں۔ اور جن لوگوں نے ابھی تک قرآن کریم سمجھ کر نہیں پڑھا ان کے لئے یہ ایک آیت ان کے سامنے بہت عظیم مقصد واضح کر دیتی ہے۔ فَمَنْ تَبِعَ هُدَایَ فَلَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَلَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ (38:2) ''جس نے میری ہدایت پر عمل کیا انہیں نہ خوف ہو گا اور نہ ہی حزن۔ اس کے بعد وہ قرآن کریم کو مکمل طور پر پڑھنے پر مجبور ہو جائے گا اگر وہ ہر طرح کے خوف اور پریشانی سے نجات پانا چاہتا ہے۔

علامہ غلام احمد پرویز علیہ الرحمۃ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

پیامِ فصلِ بہار

طلوعِ اسلام کی تیسری کنونشن

منعقدہ لاہور

19 تا 21 اپریل 1959ء

(روئیداد، ماخوذ از طلوع اسلام مئی 1959ء)

دہم بہ غمزدہ طائر پیامِ فصل بہار تہِ نشیمنِ اُو سیم و یاسمیں زیرم

رُوئیداد:

نومبر 1956ء میں طلوع اسلام کنونشن کے نام سے پہلی بار قُرآنی فکر وبصیرت کے چراغ عزم وہمت کی ایک منظم صورت لے کر (شالامار اٹاؤن۔ لاہور میں) منظرِ عام پر جلوہ بار ہوئے۔ یہ تھی بزمہائے طلوع اسلام کی اولین کنونشن۔ اکتوبر 1957ء میں دوسری بار یہ انوکھی انجمن راولپنڈی میں آراستہ ہوئی۔ اپریل 1959ء میں تیسری کنونش کا قرعہء فال پھر لاہور ہی کے نام پڑا۔۔ اور اقبالؒ کا لاہور ایک بار پھر ان قرآنی مشعلوں کی نور پاشیوں سے جگمگا اٹھا۔ موسمِ بہار، بہار آفرینیوں کے پورے جوبن سے انگڑائیاں لے رہا تھا۔ فصل بہار انتہائی فیاضی سے حسنِ جمال کے خزانے لٹا رہی تھی۔ ہر چہار اطراف نور ونکہت کی رنگینیاں کیف برسا رہی تھیں اور موسمِ گل کی ان سحر طرازیوں میں کنونشن ہاؤس کے سبزہ زار ایک بار پھر ڈھائی برس قبل کی انجمن آرائیوں کی داستانِ دلنواز دہرا رہے تھے۔ کنونشن کمیٹی کے حسنِ انتظام کی بدولت شالامار کے تاریخی چمنستان کے دامنِ پُر بہار میں خوبصورت شامیانوں کی قطاریں اُس قرآنی تحریک کے نشوونما ارتقاء اور شاندار مستقبل کی نشاندہی کر رہی تھیں جس نے صدیوں پہلے حضور رسالتمآب ﷺ والذین معہ کے مقدس ہاتھوں انسانی زندگی کی تاریک شاہراہوں کو درخشندہ ستاروں کی گزرگاہوں میں بدلا تھا اور کارگہء کائنات میں جنتِ ارضی کی بساط سی بچھ گئی تھی۔

تاریخ آج تک اس حادثۂ عظیم کے ماتم سے فارغ نہیں ہوئی کہ انسانی زندگی کی نامرادیوں اور حرماں نصیبیوں نے بہت جلد قرآنی نظام کے اس سرمایۂ بہار اور نورِ مبین کو کھو دیا اور پھر صدیاں گزر گئیں۔۔ یہ فردوسِ گم گشتہ اس کی متاعِ حیات نہ بن سکا۔

کنونشن کی فضائے روح نواز کے ذرے ذرے میں صدیوں کے بعد پھر اُسی قرآنی نظام کو انسانیت کا مرکز و محور بنانے کا عزم کروٹیں لے رہا تھا اور اسی عزمِ صمیم کی مچلتی ہوئی آرزوئیں سینوں میں لئے بزمہائے طلوعِ اسلام کے مندوب پاکستان کے اطراف و اکناف سے نجومِ سحر کی مانند کھچے چلے آ رہے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ

آفاق کے ہر گوشے سے اٹھی ہیں شعاعیں بچھڑے ہوئے خورشید سے ہوتی ہیں ہم آغوش

پنڈال کی وسعت و رفعت کے ساتھ اس کی ایک نمایاں خصوصیت یہ بھی تھی کہ اس میں مختلف مقامات پر، قرآنی آیات اور اس کی تعلیم و حکمت سے متعلق ملفوظات، قطعات کی شکل میں آویزاں تھے۔ نہایت جلی لیکن اس کے ساتھ تاج محل کی طرح حسنِ تناسب کے پیکر۔ شرکائے محفل کی نگاہیں بار بار ان قطعات کی طرف اٹھتیں اور اس خرمنِ گل و لالہ سے پُر دامن کا شانۂ چشم کی طرف واپس آئیں۔

میرِ کارواں ___ کراچی سے لاہور:

لاہور کی اس کنونشن کا مایۂ امتیاز یہ تھا کہ اولین کنونشن کا ایک اہم ترین فیصلہ گزشتہ اپریل سے حاصلِ تکمیل کو پہنچ چکا تھا اور اپنی مجبوریوں کے باوجود میرِ کارواں نے کراچی سے لاہور میں نقلِ سکونت اختیار کر لی تھی۔ ومیرِ کارواں۔

جس مرد خود آگاہ و خدا مست کی صحبت دیتی ہے گداؤں کو شکوہ جم و پرویز

اور اس طرح حکیم الامت علامہ اقبالؒ کی رحلت سے اُس کے لاہور کی جو دل کُشا انجمن اُجڑ چکی تھی بیس برس بعد بہ کمالِ شانِ زیبائی از سرِ نو آراستہ ہو چکی تھی۔ فکر و نظر اور فلسفہ و حکمت کے خمخانوں میں

پھر یہ غوغا تھا کہ لا ساقی شرابِ خانہ ساز

خوشا دہ کاروانِ شوق جس کو یہ امیرِ کارواں نصیب ہوا۔۔ اور

خوشا دہ قافلہ جس کے امیر کی ہے متاع تخیلِ ملکوتی و جذبہ ہائے بلند

مجلسِ تعارفِ باہمی:

کنونشن ہاؤس میں مندوبین کی آمد کا سلسلہ 18 اپریل کی صبح سے ہی شروع ہو گیا۔ سندھ اور وزیرستان تک کے

نمائندے طویل اور صبر آزما سفر طے کر کے شام تک پہنچ گئے اور بوقت شبِ نماز عشاء کے بعد جب تعارفِ باہمی کے سلسلے میں ان کی مجلسِ خصوصی کا انعقاد ہوا تو کم وبیش تمام مندوبین اطراف ملک سے آ چکے تھے۔ خون، رنگ اور نسل کی عصبیتوں سے پاک یہ مجلسِ شبینہ ناظم ادارہ طلوع اسلام۔۔۔کی صدارت میں منعقد ہوئی۔ مجلس کیا تھی۔

اندھیری رات میں تھیں چشمکیں ستاروں کی

ہر ایک تعارف کے سلسلے میں باری باری پلیٹ فارم پر نمودار ہو رہا تھا۔ دور دراز کی بستیوں، قصبوں اور شہروں سے سمٹ سمٹا کر یہ ستارے اس خیابانِ آرزو میں جمع تھے۔ دلوں میں درخشندہ عزائم کی تابناکیاں اور روحوں میں تڑپتی اُمنگوں کا سوز وساز میرِ کارواں کے دلِ ارجمند کی کیفیت۔ پنڈال کے ایک گوشے سے کبھی اُس کی مسرور نگاہیں اپنے کاروانِ شوق کی طرف اٹھتیں اور کبھی اپنی کٹھن راہوں کے نشانِ منزل کی طرف۔ اس کا عزمِ بلند برملا کہہ رہا تھا۔

میں ظلمتِ شب میں لے کے نکلوں گا اپنے درماندہ کارواں کو
شررفشاں ہو گی آہ میری نفس مرا شعلہ بار بار

رفقائے سفر کے دلوں سے بے ساختہ اس کے حق میں یہ دُعا ابھر رہی تھی۔

دریا متلاطم ہوں تری موجِ گہر سے

❁❁❁❁

پہلا اجلاس

پرویزؔ صاحب کا خطاب:

19 اپریل کی صبح کو 9 بجے کے قریب پہلی نشست منعقد ہوئی، جس میں استقبالیہ اور ناظم ادارہ کی رپورٹ کے بعد پرویزؔ صاحب کو مائیک پر آنے کی دعوت دی گئی، پنڈال کی فضا کا رنگ بدل گیا۔ پنڈال سے باہر ہر شخص جو کہیں نہ کہیں مصروفِ کار تھا، سب کچھ چھوڑ کر پنڈال کا رُخ کر رہا تھا۔ اس اجلاس کے لئے خصوص دعوت نامہ بھی خاصی تعداد میں جاری کئے گئے تھے۔ اور مندوبین ومبصرین کے علاوہ معزز مہمانوں کا طوفان اُمڈا چلا آ رہا تھا۔ وسیع پنڈال کے آخری گوشے تک تمام نشستیں پُر ہوگئیں اور پھر مندوبین نے نئے مہمانوں کے لئے اپنی کرسیوں کو خالی کرنا شروع کر دیا۔ خواتین کے حصہء پنڈال میں بھی تِل دھرنے کو جگہ نہ رہی۔ انتظامیہ کے قلب کو یہ کشمکش طلسم پیچ وتاب بنا رہی تھی کہ مہمانوں کے ہجوم سے پنڈال کہیں تنگیء داماں کی صورت پیدا نہ کر دے، لیکن مندوبین نے اپنی نشستوں کی پیشکش کر کے اس کشمکش کو آسودگی میں بدل دیا۔

والہانہ ذوق وشوق اور شدتِ انتظار کے دل آویز ماحول میں پرویزؔ صاحب منتظر نگاہوں کے سامنے عید کا چاند بن کر نمودار ہوئے اس بار ان کے خطاب کا عنوان تھا۔

’’پیامِ فصلِ بہار‘‘

دھم بہ غمزدہ طائر پیام فصل بہار   کہ نشیمن اُو سیم و یاسمن ریزم

’’بادہء زندگی‘‘ اور ’’خُمِ زندگی‘‘ کے بعد اس پیام بہار کی کیف انگیزیوں اور وجد آفرینیوں کے تاثرات کیا تھے؟ جذبات واحساسات کا یہ کیف ونشاط الفاظ کی زبان سے ادا کرنا ممکن نہیں۔ نظر یہی آتا تھا کہ حُسنِ بیان کے ساغر ومینا گردش میں آ گئے اور

دریائے پُر خروش زبند وشکن گزشت   از تنگنائے وادی ء وکوہ ودمن گزشت

فکر ونظر کے آسمان پر اندھیری رات میں نئے نئے ستارے جگمگانے لگے اور کاروانِ شوق نے اپنی منزل کا شہ نشان (LAND MARK) نگاہوں کے سامنے پالیا۔ سینکڑوں نگاہیں قرآن کے اس گراں مایہ طالب علم پر مرکوز تھیں۔

فطرت کا سرودِ ازلی جس کے شب وروز   آہنگ میں یکتا صفتِ سورہ ٔ رحمن

موسمِ بہار کی اس صبح کیف بار میں کم وبیش ڈیڑھ گھنٹہ تک قرآنی فکر وبصیرت کی یہ گل پاشیاں جاری رہیں۔ اس خطاب سے پرویزؔ صاحب نے ماحول کے چہرے سے تمام نقاب اُلٹ دیئے۔ انہوں نے ملک کے نئے عسکری انقلاب کا خیر مقدم کیا اور فرمایا کہ یہ انقلاب محض بساطِ سیاست کی مہرہ بازیوں کا نتیجہ نہیں، بلکہ یہ اُن کائناتی قوتوں کی کارفرمائی ہے جنہیں دنیا زمانے کے تقاضے کہہ کر یاد کرتی ہے اور یہ غنیمت ہے کہ طوفانِ بلاخیز کی آمد سے قبل ہی ہم نے اپنے ہاں وہ انقلاب پیدا کرلیا جس نے سرمایہ داری اور مفاد پرستیوں کی بساط اُلٹ کر رکھ دی۔ یہ کہتے ہوئے پرویزؔ صاحب نے زرعی اصلاحات کا خیر مقدم کرتے ہوئے اسے قرآنی نظام کی منزل کی جانب پہلا قدم قرار دیا اور کمیشن کی رپورٹ پر تبصرہ کرتے ہوئے اُمید ظاہر کی کہ حکومت اپنے منتہائے مقصود تک بتدریج پہنچنا چاہتی ہے اور اگر اس نہج پر مزید اقدامات کرتی رہی تو رفتہ رفتہ وہ قرآن کے نظامِ ربوبیت کی منزل تک پہنچ سکے گی۔

آئینِ نو کی تدوین کے سلسلے میں پرویزؔ صاحب نے کہا کہ اس سوال کو حل کرنا ابھی باقی ہے کہ ہمارا آئین کس قسم کا ہو اور وہ آئیڈیالوجی کیا تھی جس کے لئے یہ خطہء زمین حاصل کیا گیا۔ انہوں نے کہا کہ ہمارے مستقبل کا انحصار انہی سوالات کے حل پر موقوف ہے۔ وقت آ گیا ہے کہ حالات کی اس مُہلت سے کماحقہء فائدہ اٹھائیں۔ ازاں بعد پرویزؔ صاحب نے اسلامی دستور کے اساسی نکات کی بالتفصیل وضاحت کی اور کارفرمایانِ مملکت پر واضح کیا کہ فرقہ بندی کے شرکِ عظیم کو ختم کئے بغیر اسلامی آئین اور اسلامی نظام کا دعویٰ انتہائی خودفریبی کی دلیل ہوگا۔ جب اسلام دین کی ناقابلِ تقسیم وحدت میں ہر نوع کی فرقہ بندی کو کھلا شرک قرار دیتا ہے تو پھر اسلامی آئین اور مذہبی فرقوں کا بیک وقت وجود اسلام سے مضحکہ خیزی قرار پائے گی۔

آخر میں قلبِ مضطرب کی انتہائی تپش وخلش سے پرویزؔ صاحب نے رفقائے سفر سے اپیل کی کہ وہ وقت کی آواز کو پہچانیں اور قُرآنی فکر کو عام کرنے میں جو کچھ بن پڑے کر گزریں۔

پرویزؔ صاحب کے اس دلکشا خطاب کے بعد کنونش کی پہلی نشست اختتام پذیر ہوگئی۔   (یہ خطاب ہدیہ قارئین ہے)

پیامِ فصلِ بہار

پیام بہ ہمصفیرانِ چمن

سحر درشاخسارِ بوستانے چہ خوش می گفت مرغِ نعمہ خوانے
بر آور ہر چہ اندر سینہ داری سرودے ، نالہء، آہے فغانے

برادرانِ عزیز! سلام ورحمت

للہ الحمد! کہ یہ قافلہء بہار، جو آج سے قریب اڑھائی سال قبل [1] ، مانند نسیمِ صبح گاہی، نہایت نرم خرامی سے، آمادہ بہ سفر ہوا تھا، ہولناک وادیوں کی وحشت سامانیوں سے بے خطر، گل پوش وآئینہ پاش روشوں کی دلکشیوں سے بے نیاز، حوصلہ شکن وہمت رُبا چٹانوں کی راہ بندیوں سے بے پرواہ، سودائے حصولِ منزل سے سرمست، مانند کہکشاں بگریبانِ مرغزار، قدم قدم آگے بڑھتا، آج اُس مقام تک آ پہنچا ہے جہاں فضا میں ہر طرف مرغانِ ہمنوا کے چہچہے فردوسِ گوش بنتے ہیں اور ہر فرد کارواں سے پکار پکار کر کہہ رہے ہیں کہ

گئے دن کہ تنہا تھا تو انجمن میں ترے اب یہاں رازداں اور بھی ہیں

آپ احباب نے، اس مختصر سے عرصہ میں باغ وراغ، مملکت کے ہر گوشے میں جس جوش نوائی اور ہم آہنگی سے نشیدِ قرآنی کو عام کیا ہے یہ اس کا اثر ہے کہ آج اس کا ہر مُرغِ خوش الحان آپ کا ہمنوا دکھائی دیتا ہے اور اس حقیقتِ کبریٰ کی علی وجہ البصیرت شہادت دیتا ہے کہ

شورشِ عندلیب نے روح چمن میں پھونک دی ورنہ یہاں کلی کلی مست تھی خواب ناز میں

کنونشن کی تاریخوں میں تبدیلی:

آپ نے راولپنڈی میں اس اجتماع کے لئے تاریخوں میں تبدیلی کا جو فیصلہ کیا، بظاہر اس کا محرک جذبہ موسم کی ناسازگاری سے تحفظ تھا۔ لیکن آج ایسا محسوس ہوتا ہے کہ کی فکری اور قلبی دنیا میں جو انقلابات بیدار ہو رہا ہے، اُس فیصلہ میں غیر شعوری طور پر، اُس کا بھی ہاتھ کارفرما تھا۔ بہار کا موسم وہ ہے جس میں کائنات کے گوشے گوشے میں نئی زندگی کی نمود ہوتی ہے۔ شجرِ حیات کی ہر شاخ سے حسنِ خوابیدہ انگڑائیاں لے کر بیدار ہوتا ہے۔ چٹیل میدانوں سے سبزہء نورُستہ اور خشک ٹہنیوں سے گل نو ومیدہ آنکھیں ملتا ہوا اٹھتا ہے اور ہر دیدۂ بینا سے پکار پکار کر کہتا ہے کہ فَانْظُرْ اِلٰٓی اٰثٰرِ رَحْمَتِ اللّٰہِ کَیْفَ یُحْیِ

[1] پہلی کنونشن نومبر 1956ء میں منعقد ہوئی تھی۔

الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا ط (30:50) تم مبداءِ فیض کی نیساں باریوں اور گہرفشانیوں کو دیکھو کہ اس نے کس طرح زمینِ مردہ کو حیاتِ تازہ عطا کر دی ہے۔

خیز کہ درکوہ و دشت خیمہ زد ابرِ بہار
مست ترنم ہزار
طوطی ودراج وسار
بر طرفِ جوئبار
کشتِ گل ولالہ زار
چشمِ تماشا بیار
خیز کہ در کوہ ودشت خیمہ زد ابر بہار
خیز کہ در باغ وراغ قافلہء گل رسید
باد بہاراں وزید
مُرغ، نوا آفرید
لالہ، گریباں درید
حسن، گلِ تازہ چید
عشق، غمِ نو خرید
خیز کہ درباغ وراغ قافلۂ گل رسید

حیاتِ نو کی طلب:

خدا کے کائناتی قانون کا یہی تقاضا تھا جس سے آپ، غیر شعوری طور پر متاثر ہو کر اس مقام پر موسمِ بہار میں خیمہ زن ہوئے ہیں تا کہ اپنے نشوونما دینے والے سے کہیں کہ ہم نے خارجی کائنات میں تیرے نظامِ ربوبیت کی ندرت کاریوں سے حیاتِ نو کی نمود دیکھ لی ہے۔ لیکن ہماری آرزو یہ ہے کہ رَبِّ اَرِنِیْ کَیْفَ تُحْیِ الْمَوْتٰی ط (2:260) ہمیں دکھا کہ تو دلوں کے ویرانوں کو کس طرح از سرِ نو آباد کیا کرتا ہے اور مردہ قوموں کو کس طرح زندہ اقوام کی صف میں کھڑے ہونے کے قابل بنایا کرتا ہے۔ یہی ہے وہ نقطہء پرکارِ تمنا جس کے لئے ہم یہاں جمع ہوئے ہیں اور یہی ہے وہ سوال جس کے جواب کے لئے ہم اُس خدائے بلند و برتر کی آستان پر جھولی پھیلائے کھڑے ہیں جس کا اعلان ہے کہ: اُجِیْبُ دَعْوَۃَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ ۙ (2:186) میں (اپنی کتابِ زندہ کے ذریعے) ہر اُس شخص کے سوال کا جواب دیتا ہوں جو مجھے پکارتا ہے۔ وہاں سے جواب لینے کے لئے انسان کی پکار میں سچی طلب، آرزو میں شدت اور ذہن میں سمجھنے کی صلاحیت شرط ہے۔ جب مانگنے الا

اس نہج سے مانگتا ہے تو اس کی کتاب خود آگے بڑھ کر اس کا استقبال کرتی ہے۔

شعاعِ مہر خود بیتاب ہے جذبِ محبت سے حقیقت ورنہ سب معلوم ہے پروازِ شبنم کی

خوش بخت ہیں وہ جو صحنِ چمنِ کائنات کی لالہ کاریوں کے ساتھ، اپنے دل کی کھیتی کی سیرابیوں اور شادابیوں کے سامان کی بھی تلاش کریں۔ طُوْبٰی لَھُمْ وَحُسْنُ مَاٰبٍ (13:29)

❁❁❁❁❁

عسکری انقلاب:

رفیقانِ محترم! جب ہم پچھلی مرتبہ (اکتوبر 1957ء) راولپنڈی میں جمع ہوئے تھے، اس کے بعد ہمارے ہاں کی فکر و نظر کی دنیا میں جو تبدیلیاں ہوئی ہیں، ان سے کہیں بڑھ کر وہ خارجی انقلاب ہے جو مملکتِ پاکستان میں نمودار ہوا ہے [1]۔ سطح بین نگاہوں کے نزدیک یہ انقلاب شاید محض بساطِ سیاست کی مہرہ بازیوں کا نتیجہ ہو لیکن جن کی نظریں سطح سے نیچے اُتر کر گہرائی تک پہنچتی ہیں وہ جانتے ہیں کہ اس کے پیچھے کائناتی قوتوں کا ہاتھ بھی کارفرما تھا۔ یہی وہ قوتیں ہیں جنہیں عام الفاظ میں زمانے کے تقاضے کہا جاتا ہے۔ زمانے کے تقاضے پکار پکار کر کہہ رہے تھے کہ

پُرانی سیاست گری خوار ہے زمیں میر وسلطان سے بیزار ہے
گیا دورِ سرمایہ داری گیا! تماشا دکھا کر مداری گیا!

دنیا تو اس پکار کو دل کے کانوں سے سن رہی تھی لیکن ہماری حالت یہ تھی کہ ہم اپنے کانوں پر مفاد پرستیوں کے لحاف لپیٹ کر سو رہنا چاہتے تھے۔ اگر کچھ وقت تک اور ہمارا یہی حال رہتا تو کم از کم مجھے تو صاف نظر آ رہا تھا کہ اس خلا کو پُر کرنے کے لئے کمیونزم کا سیلاب اپنی تلاطم انگیزیوں کے ساتھ اُمنڈ کر آ جائے گا اور ہمارے تمام نظریاتِ زندگی اور تصوراتِ حیات کو خس و خاشاک کی طرح بہا کر لے جائے گا۔ غنیمت ہے کہ اس طوفانِ بلاخیز کی آمد سے پہلے ہم نے خود اپنے ہاتھوں سے اپنے ہاں ایسی تبدیلی پیدا کر لی جس سے سرمایہ داری کو پروردہ اور مفاد پرستیوں کی سیاست کی بساط اُلٹ گئی۔ اس انقلاب کا پہلا مظاہر زرعی اصلاحات [2] کی شکل میں سامنے آیا ہے۔

زرعی اصلاحات:

قرآن کریم کی رُو سے، ملکیتِ زمین کو جو پوزیشن ہے اس کے متعلق ہمارے لٹریچر میں اتنا کچھ آ چکا ہے کہ اس وقت اس ضمن میں تفصیل سے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ جیسا کہ آپ احباب کو معلوم ہے، اسلام میں زمین کی انفرادی یا اجتماعی ملکیت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ قرآن نے معاشی نظام کا جو تصور دیا ہے اس کی رُو سے۔

---

[1] اکتوبر 1958ء میں، کمانڈر ان چیف جنرل محمد ایوب خان کی زیرِ قیادت عسکری انقلاب۔

[2] ان اصلاحات کی رُو سے انفرادی ملکیت زمین کے رقبہ کی (پان سوا ایکڑ تک) تحدید کر دی گئی تھی۔ (طلوعِ اسلام)

(1) زمین تمام نوعِ انسانی کے لئے رزق کا سرچشمہ ہے۔

(2) اسلامی مملکت کی ذمہ داری ہے کہ وہ تمام افراد کی بنیادی ضروریاتِ زندگی بہم پہنچائے۔ اس میں ذمہ داری کا لفظ قابلِ غور ہے۔ یعنی مملکت صرف اتنا کہہ دینے سے اپنے فریضہ سے سبکدوش نہیں ہوسکتی کہ ہم لوگوں کے لئے سامانِ زیست بہم پہنچانے کی پوری پوری کوشش کریں گے۔ سامانِ زیست کی بہم رسانی اس کی بنیادی ذمہ داری اور اس کی ہستی کے لئے وجہء جواز (JUSTIFICATION FOR ITS EXISTENCE) ہے۔ اَلَّذِیۡنَ اِنۡ مَّکَّنّٰہُمۡ فِی الۡاَرۡضِ اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتَوُا الزَّکٰوۃَ وَاَمَرُوۡا بِالۡمَعۡرُوۡفِ وَنَہَوۡا عَنِ الۡمُنۡکَرِ ؕ وَلِلّٰہِ عَاقِبَۃُ الۡاُمُوۡرِ ﴿۴۱﴾ (22:41) قرآن کا واضح ارشاد ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ جب خدا کے نام پر مملکت قائم کرنے والوں کو اقتدار حاصل ہوگا تو وہ ایسا معاشرہ قائم کریں گے جس میں تمام افراد قوانینِ خداوندی کا اتباع کریں۔ یہ معاشرہ تمام افراد انسانیہ کو ان کی نشوونما کا سامان بہم پہنچائے گا، اُن باتوں کا حکم دے گا جنہیں قرآن کی بنیادی تعلیم صحیح تسلیم کرے، ان سے روکے گا جنہیں وہ نامناسب قرار دے۔ مختصراً یہ کہ اِس معاشرہ میں ہر معاملہ کا فیصلہ کتاب اللہ کے مطابق ہوگا۔

(3) ظاہر ہے کہ یہ مملکت اپنی اس اہم ذمہ داری سے عہدہ برا نہیں ہوسکتی جب تک ذرائع رزق اس کی تحویل میں نہ رہیں۔

(4) لہٰذا، قُرآن کی رو سے، زمین اور دیگر وسائل پیداوار کا مملکت کی تحویل میں رہنا ضروری ہے۔ اس کے برعکس، ہمارے ہاں ''شریعت کا فیصلہ'' یہ بتایا جاتا تھا (یعنی اُس شریعت کا فیصلہ جو ہمارے جاگیردارانہ دور میں وضع ہوئی تھی) کہ زمین پر انفرادی ملکیت بے حد و نہایت جائز ہے اور (اس کا کلیۃً مملکت کی تحویل میں چلے جانا تو ایک طرف) حکومت کو اس کا بھی حق نہیں پہنچتا کہ اس پر کسی قسم کی تحدید (LIMITATION) عاید کر سکے۔ اس انقلاب نے زمین کی ملکیت کی حد بندی کر کے اس غلط مفروضہ کو کالعدم قرار دیدیا ہے کہ زمین پر افراد کی ملکیت ہوتی ہے اور اس پر کسی قسم کی حد بندی نہیں کی جاسکتی۔ زرعی اصلاحات کمیشن کی رپورٹ میں تو اس حقیقت کو بھی تسلیم کرلیا گیا ہے کہ زمین پر افراد کی ملکیت ہو نہیں سکتی۔ اس میں، پہلے موجودہ مالکانِ اراضی کا نظریہ پیش کرتے ہوئے کہا گیا ہے کہ

زرعی کمیشن کی رپورٹ:

> زمیندار کے نقطۂ نگاہ سے زمین کی ملکیت پر کسی قسم کی حد بندی کرنا ایک حادثۂ عظیم ہے۔ اُس کے نزدیک ایسا اقدام کمیونزم کے مترادف اور یکسر غیر اسلامی ہے۔ وہ ایسا کہتے وقت اس بات کو قابلِ اعتنا ہی نہیں سمجھتا کہ کم از کم چار اسلامی مملک ۔۔ یعنی مصر، شام، ترکی اور عراق ۔۔ نے ملکیتِ زمین پر حد بندی عاید کر رکھی ہے۔ اُس کا کہنا یہ ہے کہ اس مقصد کے لئے زمین کو دیگر اقسامِ جائیداد سے الگ کیوں کیا جاتا ہے۔ اگر زمنی کی ملکیت پر حد بندی عائد کرنی ہے تو دولت کی دیگر اقسام، مثلاً کارخانوں وغیرہ پر بھی اسی طرح حد بندی عاید کرنی چاہئے۔ (رپورٹ، ص:25-26)

آپ احباب اس حقیقت سے بے خبر نہیں کہ یہ دلائل زمیندار کے ذہن کے پیدا کردہ نہیں۔ انہیں ہمارے علمبردارانِ شریعت نے ان کے لئے بہم پہنچایا تھا[1]۔ (یہ جملہ معترضہ تھا) رپورٹ میں مندرجہ بالا نظریہ پیش کرنے کے بعد لکھا ہے۔

زمیندار کو اس حقیقت کو ہمیشہ سامنے رکھنا چاہئے کہ زمین پر حق ملکیت مطلق (ABSOLUTE) نہیں۔

(ص:26)

اس نقطہ کی وضاحت کے لئے ''زمین کے معاوضہ'' کے سلسلہ میں رپورٹ میں لکھا ہے کہ

ہم نے ملکیتِ زمین کے سوال پر بحث کرتے وقت یہ کہا تھا کہ جب تک زمین کی پیداوار میں مملکت کا حق تسلیم کیا جائے گا جو لگان کی شکل میں ادا کیا جاتا ہے، زمین کی ملکیت کو مطلق (FULL-OWNERSHIP) قرار نہیں دیا جا سکتا۔ نظری طور پر دیکھا جائے تو مملکت کو اس کا پورا پورا اختیار ہے کہ وہ شرحِ لگان اس قدر بڑھا دے کہ مالکِ اراضی کو زمین کی پیداوار میں سے کچھ بھی نہ بچے۔ چونکہ ''زمین کی قیمت'' سے مفہوم یہ ہے کہ زمیندار کو زمین سے جو کچھ حاصل ہونا تھا اسے یک مشت ادا کر دیا جائے اس لئے، مذکورہ بالا نظریہ کی روشنی میں، یہ چیز حقِ ملکیت کے بنیادی تصور کے قطعاً خلاف نہیں کہی جا سکتی۔ اگر مملکت، زمین کا کچھ بھی معاوضہ نہ دے۔ (ص:43)

آپ نے دیکھا کہ زرعی کمیشن اپنی تحقیقات کے بعد جس نتیجہ پر پہنچا ہے وہ کس طرح قرآن ک بنیادی تصور کے قریب ہے۔ تاریخ بتاتی ہے کہ حضرت عمرؓ کے زمانے میں مملکت کو ایسے قطائع اراضی کی ضرورت پڑی جو اس وقت تک افراد کے پاس تھے تو انہیں بلا معاوضہ حاصل کر لیا گیا۔ نیز جو لوگ اسلام لاتے ان کی زمینیں شروع ہی سے مملکت کی تحویل میں چلی جاتیں۔ ان تصریحات سے یہ حقیقت آپ کے سامنے آ گئی ہوگی کہ اراضیات کی تحدید کے متعلق حکومت کا فیصلہ قرآنی نظامِ معاش کی سمت، ایک جراتمندانہ اقدام ہے۔

رقبۂ اراضی:

حکومت نے جس قدر رقبہء اراضی انفرادی ملکیت میں رہنے دیئے جانے کا فیصلہ کیا ہے، بعض حضرات کے نزدیک وہ بہت زیادہ ہے۔ اور تو اور، خود زرعی کمیشن کے ایک ممبر (غلام اسحٰق خان صاحب) کی بھی یہی رائے تھی جس کا اظہار رپورٹ میں کیا گیا ہے۔ لیکن کمیشن نے اس ضمن میں کہا ہے کہ

تحدید ملکیت کے متعلق ہم نے جو کچھ تجویز کیا ہے اس باب میں متعدد عناصر نے ہماری راہ نمائی کی ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ غیر محدود ملکیت سے محدود ملکیت کی طرف انتقال، ایسے ہموار انداز سے ہو کہ زمیندار کے لئے اپنے ماضی سے انقطاع اس قسم کی دشواریاں پیدا نہ کرے جن کی وجہ سے اسے زندگی بسر کرنا مشکل

[1] دیکھئے ''مسئلہ ملکیتِ زمین'' از سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب۔

ہوجائے۔یعنی اس کی آمدنی میں یک لخت اتنی کمی نہ آجائے جس سے اس کا گزارہ نہ ہوسکے۔(ص:29)

اس سے ظاہر ہے کہ حکومت اس باب میں اپنے منتہیٰ تک بتدریج پہنچنا چاہتی ہے۔یعنی انہوں نے جو موجودہ فیصلہ کیا ہے تو یہ آنسوؤں کی کمی نہیں ہے، رعایت طرفِ آستیں ہے

اس سے اُمید کی جاسکتی ہے کہ حکومت اگر اسی نہج سے مزید اقدامات کرتی رہی تو وہ رفتہ رفتہ قرآن کی متعین کردہ منزل تک پہنچ جائے گی جہاں نہ صرف زمین، بلکہ جملہ وسائل پیداوار، انفرادی ملکیت سے نکل کر مملکت کی تحویل میں چلے جاتے ہیں اور مملکت ان سے، افرادِ مملکت کی بنیادی ضروریاتِ زندگی مہیا کرنے کی عظیم ذمہ داری سے عہدہ برآ ہوتی ہے۔اسی کو نظامِ ربوبیت کہتے ہیں جو خدا کی صفتِ رب العالمینی کا (بشری حدود کے اندر) عکس ہے۔صِبۡغَةَ اللّٰهِ ۚ وَمَنۡ اَحۡسَنُ مِنَ اللّٰهِ صِبۡغَةً ۟ وَّنَحۡنُ لَهٗ عٰبِدُوۡنَ (2:138)

انسانیت کی نجات وسعادت:

آپ نے غور کیا کہ خدا کے کائناتی قوانین کس طرح دنیا کو صحیح راستہ کی طرف لائے چلے جارہے ہیں۔حقیقت یہ ہے کہ انسانیت کی نجات وسعادت کے لئے اُس راستے کے علاوہ کوئی دوسرا راستہ نہیں ہے جسے قرآن کریم نے ابدی اصولوں کی حیثیت سے متعین کرکے دے دیا ہے۔دنیا جتنے اور راستوں پر جی چاہے چل کر دیکھ لے، اسے اپنے ناکام تجارب کے بعد اُس راستے کی طرف آنا ہوگا جس کا تعین قرآن نے کیا ہے اور جس پر اُس ذاتِ اقدس واعظمؐ (علیہ التحیۃ والسلام) کے نقوشِ قدم درخشندہ ستاروں کی طرح چمک رہے ہیں جس نے خود اس راستہ پر چل کر نوعِ انسان کو احترامِ آدمیت کی منزل تک پہنچا کر دکھایا تھا۔زمانہ اس حقیقت پر شاہد ہے کہ اس چودہ سو سال کے عرصہ میں جس قدر صحیح انقلابات رونما ہوئے ہیں، ان سب کا رُخ اسی منزل کی طرف تھا۔اور جو صحیح انقلاب اسکے بعد برپا ہوں گے ان کا رُخ بھی اسی سمت کو ہوگا۔

شمعِ نظر، خیال کے انجم، جگر کے داغ جتنے چراغ ہیں اُسی محفل سے آئے ہیں!

احبار ورہبان:

لیکن جہاں یہ حقیقت وجہِ صد مسرت ہے کہ انسانیت ہر ناکام تجربہ کے بعد قرآن کے متعین کردہ نصب العین کی طرف آتی ہے وہاں یہ امر باعثِ ہزار تعجب وت اُسف ہے کہ قرآن کی سب سے زیادہ مخالفت خود ہمارے اربابِ مذہب کی طرف سے ہوتی ہے۔

یکے بشہر نگہ کن، چہ انقلاب افتاد کہ رندِ میکدہ بیدار وپارسا خفت است

اور یہ بھی کوئی نئی بات نہیں۔قرآن کریم نے مسلمانوں کو واضح الفاظ میں متنبہ کردیا تھا کہ: یٰۤاَیُّهَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡۤا اِنَّ كَثِیۡرًا مِّنَ الۡاَحۡبَارِ وَالرُّهۡبَانِ لَیَاۡكُلُوۡنَ اَمۡوَالَ النَّاسِ بِالۡبَاطِلِ وَیَصُدُّوۡنَ عَنۡ سَبِیۡلِ اللّٰهِ ؕ (9:34) اے ایمان والو! اس حقیقت کو بگوش ہوش سن رکھو کہ علماء ومشائخ کی اکثریت کا یہ عالم ہے کہ یہ لوگوں کا مال، تعمیری نتائج مرتب کئے

بغیر، ناحق کھا جاتے ہیں اور خدا کے بندوں کو خدا کے راستے سے بہکا کر دوسرے راستوں پر ڈال دیتے ہیں۔ تاریخِ انسانیت اور خود اسلام کی سرگزشت اس پر شاہد ہے کہ ملحد اور بے دین لوگ، دوسروں کو خدا کے راستے سے پھیرنے میں کبھی اتنے کامیاب نہیں ہوئے تھے جتنے کامیاب وہ لوگ ہوتے ہیں جن کا دعویٰ ہو کہ وہ خدا کی طرف دعوت دینے والے ہیں لیکن درحقیقت وہ خدا کا راستہ روک کر کھڑے ہیں۔ اس کی وجہ ظاہر ہے، جھوٹ اگر کسی کے سامنے اپنی اصل شکل میں (بے نقاب) آئے تو وہ کبھی کامیاب نہیں ہو سکتا۔ اسے اپنی کامیابی کے لئے ضروری ہے کہ وہ سچ کا لبادہ پہن کر آئے۔

جھوٹ، سچ کے نقاب میں:

ایک شخص آپ کے پاس آ کر کچھ باتیں کرتا ہے۔ آپ یقین کر لیتے ہیں اور جو کچھ وہ چاہتا ہے ویسا کرنے پر آمادہ ہو جاتے ہیں، لیکن عین اس وقت وہ آپ سے کہتا ہے کہ بھئی! میں نے جو کچھ آپ سے کہا وہ سب جھوٹ ہے۔ کہئے! اس کے بعد اس کے لئے وہ کچھ کر دیں گے جس کے لئے آپ آمادہ ہو چکے تھے؟ کبھی نہیں کریں گے۔ آپ وہ کچھ اسی صورت میں کریں گے جب وہ آخر تک قسمیں اٹھا اٹھا کر آپ کو یقین دلاتا جائے کہ وہ جو کچھ کہتا ہے سچ ہے۔ اس سے واضح ہے کہ جھوٹ کو اپنی کامیابی کے لئے سچ کا نقاب اوڑھنا پڑتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ خدا کا راستہ روکنے میں وہی کامیاب ہو سکتے ہیں جو خدا پرستی کا نقاب اوڑھ کر سامنے آئیں۔ یہی وہ حقیقت ہے جس کی طرف قرآن نے یہ کہہ کر اشارہ کیا ہے کہ ان لوگوں کی ٹیکنیک یہ ہے کہ: يَكْتُبُونَ الْكِتَابَ بِأَيْدِيهِمْ ثُمَّ يَقُولُونَ هَٰذَا مِنْ عِندِ اللَّهِ (2:79) خود اپنی طرف سے بات بناتے ہیں (اپنے ہاتھوں سے فتویٰ لکھتے ہیں) اور اس کے متعلق مشہور یہ کرتے ہیں کہ وہ خدا کا حکم ہے، اور مقصد اس سے یہ ہوتا ہے کہ: لِيَشْتَرُوا بِهِ ثَمَنًا قَلِيلًا (2:79) تاکہ اس سے چار پیسے کما لئے جائیں۔ اگر یہ لوگ اپنے فتاویٰ کے متعلق کہیں کہ انہیں ہم نے اپنے جی سے گھڑ لیا ہے، وہ خدا کا حکم نہیں تو کوئی شخص ان کے فریب میں نہ آئے۔ ان کا فریب کامیاب ہوتا ہی اس صورت میں ہے جب یہ اپنے فیصلوں کو خدا کا حکم کہہ کر پیش کریں۔

دوسری قوموں کے لئے یہ معلوم کرنا مشکل تھا کہ جو کچھ ان کے اربابِ شریعت ان سے کہتے ہیں، وہ خدا کا حکم ہے یا ان کا اپنا فیصلہ، اس لئے کہ اُن کے پاس خدا کی کتاب اپنی اصل شکل میں موجود نہیں تھی۔ لیکن ہماری پوزیشن اُن سے بالکل مختلف ہے۔ ہمارے پاس خدا کی کتاب حرفاً حرفاً محفوظ ہے اور ہر شخص کی اُس تک رسائی ہو سکتی ہے۔

یہ غنیمت ہے درِ میخانہ اب تک باز ہے

ہمارے لئے کرنے کا کام فقط اتنا رہ جاتا ہے کہ جو کچھ ہمارے سامنے دین کے نام سے پیش کیا جائے اسے خدا کی کتاب کے سامنے لیجائیں اور اس سے فیصلہ لے لیں کہ وہ واقعی خدا کا حکم ہے یا اس کی طرف یونہی منسوب کر دیا گیا ہے۔

چارہ این است کہ از عشق کشادے طلبیم　　پیشِ او سجدہ گزاریم و مرادے طلبیم

❁❁❁❁❁

آئین کی تنسیخ:

برادرانِ عزیز! عسکری انقلاب کا پہلا کارنامہ آپ کے سامنے آ چکا۔ اس کا دوسرا کارنامہ اُس آئین کی تنسیخ ہے جس کا اکثر و بیشتر حصہ غیر اسلامی تھا لیکن اس کے باوجود حضرات علماء کرام نے اس کے عین اسلامی ہونے کا فتویٰ صادر فرما دیا تھا۔ ہم، جو خطہء پاکستان میں خالص قرآنی نظام کی تشکیل کے متمنی ہیں، ہزار چاہتے تھے کہ 1956ء کا آئین بلا تاخیر قرآنی آئین میں تبدیل ہو جائے۔ لیکن ہمارے لئے اُس آئین میں ضروری اور بنیادی تبدیلیاں کرانے کے لئے آئینی اور جمہوری طریق کے علاوہ کوئی چارہء کار نہ تھا اور ہماری کوششوں کا رُخ اسی سمت کو تھا۔ ہم اچھی طرح سمجھتے تھے کہ یہ راستہ بڑا طویل اور زمانے کی رفتار بڑی تیز ہے۔ لیکن، جیسا کہ میں نے ابھی ابھی کہا ہے، ہمارے سامنے اس کے سوا کوئی طریق کار نہیں تھا۔ مسافت کی لمبائی سے گھبرا کر خود اپنے احباب میں سے بعض میرے پاس آتے اور کہتے کہ اس طریق سے ہم اپنی منزل تک کس طرح اور کب پہنچ سکیں گے۔

آہ کو چاہئے اک عمر اثر ہونے تک کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہونے تک

میں ان سے کہتا کہ مجھے آپ کی بیتابیِ تمنا کا پورا پورا احساس ہے لیکن آپ کو صبر طلبیِ عشق [1] پر بھی تو نگاہ رکھنی پڑے گی۔ لیکن میں دیکھتا تھا کہ اس سے ان کا اطمینان نہیں ہوتا تھا اور یوں ان قلوب پر بھی مایوسی اثر انداز ہوتی چلی جا رہی تھی، جنہیں اقرار تھا کہ مایوسی کفر ہے۔ ان حالات میں عسکری انقلاب آیا اور اس نے بیک جنبشِ قلم پورے کے پورے آئین کو کالعدم قرار دے دیا۔

عشق کی اک جست نے طے کر دیا قصہ تمام اس زمین و آسماں کو بے کراں سمجھا تھا میں

تخریب کے بعد تعمیر:

لیکن یہ اس پروگرام کا صرف تخریبی حصہ ہے اور یہ ظاہر ہے کہ جس تخریب کے ساتھ تعمیر نہ ہو وہ تخریب مفید ہونے کے بجائے الٹی مضر ہو جاتی ہے۔ اسی لئے قرآن نے کہا ہے کہ: فَمَنْ يَّكْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَيُؤْمِنْۢ بِاللّٰهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى ۗ لَا انْفِصَامَ لَهَا ؕ (2:256) جو شخص غیر خدائی قانون سے انکار کر کے، قانونِ خداوندی کو اپنا نصب العین بناتا ہے، وہ ایسے محکم رشتے کو تھام لیتا ہے جو کبھی نہیں ٹوٹ سکتا۔ اقبال کے الفاظ میں۔

کہنہ را در شکن و باز بہ تعمیر خرام ہر کہ در ورطہ لا ماند بہ الا نرسید

اس اعتبار سے دیکھئے تو آج ہم پھر اس مقام پر کھڑے ہیں جہاں 1947ء میں تھے۔ یعنی ہمارے پاس ایک آزاد مملکت ہے جس کا آئین ہم نے مرتب کرنا ہے۔ سوال یہ ہے کہ وہ آئین کی قسم کا ہونا چاہئے۔ ہم نے 1948ء تک اپنی بساط کے مطابق، مسلسل کوشش کی کہ قوم کو بتایا جائے کہ وہ آئیڈیالوجی کیا تھی جسے عملی قالب میں ڈھالنے کے لئے پاکستان کا

[1] عاشقی صبر طلب اور تمنا بیتاب دل کا کیا رنگ کروں خونِ جگر ہونے تک

خطہء زمین حاصل کیا گیا تھا، اور ایک اسلامی مملک کا آئین کس قسم کا ہوتا ہے۔ اگرچہ ہماری طرف سے پیش کردہ قرآنی تصور، ہماری توقعات سے زیادہ عام ہوا لیکن مفاد پرست گروہوں کے حربے زیادہ مؤثر تھے اس لئے مملک کا آئین اسلامی نہ بن سکا۔ معلوم ہوتا ہے کہ فطرت کی میزان میں ہماری یہ ہلاکت ابدی نہ تھی۔ اس لئے ہمیں دوبارہ موقع دیا گیا ہے کہ ہم اپنی غلطی کی تلافی کر سکیں ورنہ عام طور پر ہوتا یہی ہے کہ

فطرت افراد سے اغماض بھی کر لیتی ہے کبھی کرتی نہیں ملت کے گناہوں کو معاف

آئینِ نو کی ترتیب کا سوال:

لیکن ملک کی بدقسمتی ملاحظہ کیجئے کہ ادھر آئین کی ترتیب نو کا سوال سامنے آیا اور اُدھر پھر اُنہی تخریبی عناصر نے سر نکالنا شروع کر دیا جنہوں نے اس سے پہلے نو سال تک اپنی ہر قوت کو اس ''جہادِ عظیم'' میں صرف کر دیا تھا کہ پاکستان میں صحیح اسلامی آئین مرتب نہ ہونے پائے خواہ اس سے خود اسلام دنیا کی نظروں میں اضحوکہ کیوں نہ بن جائے۔ اور اسلامک آئیڈیالوجی کے دعاوی فریب بن کر کیوں نہ دکھائی دینے لگیں۔

خوشم کہ گنبدِ چرخِ کہن فرو ریزد اگرچہ خود ہمہ بر فرقِ من فرو ریزد

اب پھر نئے سرے سے ان سوالات میں خلط مبحث پیدا کیا جا رہا ہے کہ اسلامی آئین کسے کہتے ہیں۔ اسلامی مملکت کے امتیازی خط وخال کیا ہوتے ہیں۔ کیا پاکستان میں اسلامی آئین مرتب کیا جا سکتا ہے (وغیرہ وغیرہ)۔ جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں، ان موضوعات پر میں مسلسل دس برس سے لکھتا چلا آ رہا ہوں اس لئے اس وقت ان تفاصیل میں جانے کی نہ ضرورت ہے نہ فرصت۔ میرے خیال میں اس وقت صرف اتنا کافی ہوگا کہ اسلامی مملکت کا اجمالی تصور آپ حضرات کے سامنے پیش کر دیا جائے۔

سیکولر اسٹیٹ اور قُرآنی مملکت میں فرق:

سب سے پہلا سوال یہ ہے کہ سیکولر اسٹیٹ (SECULAR STATE) اور قرآن کی رُو سے دینی مملکت میں کیا فرق ہے۔ تفاصیل کے اعتبار سے دیکھئے تو ان دونوں کے فرق کی داستان طول طویل ہے لیکن اصولی طور پر سمجھنا چاہیں تو اسے چند فقروں میں سمٹایا جا سکتا ہے۔ سیکولر اسٹیٹ کا مقصود ومنتہی اپنے ملک یا قوم کے مفاد کا تحفظ ہوتا ہے اور اس مقصد کے حصول کے لئے جو ذریعہ مناسب سمجھا جائے اس کا اختیار کر لینا نہ صرف جائز بلکہ ضروری قرار پا جاتا ہے۔ بالفاظِ دیگر اس اسٹیٹ کا اصول (اگر ایسا کہنے سے اصول کے لفظ کی توہین نہ ہو) مصلحتِ وقت کا تقاضا (EXPEDIENCY) ہوتا ہے۔ اربابِ علم

سے پوشیدہ نہیں کہ اس مذہبِ سیاست کا امام اٹلی کا مشہور مدبر میکیاولی (NICCOLO- MACHIAVELLI) اور اس کا صحیفہ، اس کی شہرہ ءآفاق کتاب (THE PRINCE) ہے۔ اس کتاب میں وہ جس مسلک کی تلقین کرتا ہے اس کا ملخص یہ ہے کہ:

> ہر وہ حربہ جس سے سلطنت کی قوت بڑھے، مستحق ستائش ہے اور ہر وہ فریب جس سے کامیابی حاصل ہو درخورِ تبریک وتحسین۔ عدل وانصاف، قوت کا دوسرا نام ہے جس کی لاٹھی اس کی بھینس، فطرت کا صحیح اصول ہے۔ جنگ ہو یا امن، مملکت کے لئے سب سے زیادہ مؤثر ہتھیار قوت اور فریب ہے۔ حکمران کے لئے صفتِ روباہی نہایت ضروری ہے تاکہ وہ دجل وفریب کے جال بچھا سکے اور خوئے شیری بھی تاکہ وہ بھیڑیوں کو خائف رکھ سکے۔ اس میں نیک عادات کا ہونا ضروری نہیں، البتہ یہ ضروری ہے کہ ایسا معلوم ہو کہ وہ بڑا نیک ہے۔ اگر اس میں کوئی نیک عادت پیدا ہو جائے تو اس میں بھی چنداں مضائقہ نہیں لیکن یہ نہایت ضروری ہے کہ اس کے دل کی حالت ہمیشہ ایسی رہے کہ جونہی وہ دیکھے کہ مصلحتِ وقت کا تقاضا ایسا ہے کہ اُس نیک عادت کو الگ کر دیا جائے۔ تو وہ بلا ادنیٰ تامل اس کے خلاف عمل کر سکے۔

عصرِ حاضر میں مذہبِ سیاست کی یہی وہ بائبل ہے جس سے متاثر ہو کر (LORD GREY) نے کہا تھا کہ ''سلطنتوں کے معاملات اخلاقی ضابطوں کی رُو سے طے نہیں پایا کرتے'' اور (WALPOLE) نے لکھا تھا کہ:

> نیک آدمی کسی بڑی سلطنت کو بچا نہیں سکتے۔ اس لئے کہ سلطنتوں کو بچانے کے لئے جس حد تک بعض اوقات جانا ضروری ہو جاتا ہے، نیک آدمی وہاں تک جا نہیں سکتے۔

یہی وہ سیاست ہے جس کی رُو سے اخلاقیات کو دو حصوں میں تقسیم کیا جاتا ہے، ایک (PRIVATE MORALITY) اور دوسرا (PUBLIC MORALITY) یعنی ذاتی معاملات میں ضابطہء اخلاق اور ہونا چاہئے اور سیاسی معاملات میں اور۔ ان دونوں ضوابط میں کیا فرق ہے، اس کے لئے اٹلی کے مشہور سیاستدان (CAVOUR) کا یہ اعتراف کسی وضاحت کا محتاج نہیں جس میں اس نے کہا ہے کہ

> اگر ہم وہی کچھ اپنی ذات کے لئے کریں جو کچھ ہم نے مملکت کے لئے کیا ہے تو ہم کتنے بڑے شیاطین کہلائیں گے۔

دینی مملکت کا اُصولی تصور:

اس معیار کے مطابق کوئی ''محب وطن'' جتنا بڑا شیطان ہوتا ہے مملکت اتنا ہی بڑا اس کا مجسمہ نصب کرتی ہے اور وہ آنے

والی نسلوں کے لئے ہیرو قرار پا جاتا ہے۔ یہ ہے سیکولر اسٹیٹ کا بنیادی تصور۔ اس کے برعکس دینی مملکت کا تصور یہ ہے کہ انسانی زندگی کے لئے کچھ اصول ایسے ہیں جو غیر متبدل (INVIOLABLE) ہیں۔ ان میں کسی حالت میں بھی تغیر و تبدل نہیں کیا جا سکتا۔ سیکولر اسٹیٹ میں اقتدارِ اعلیٰ (SOVEREIGNTY) جمہور کو حاصل ہوتا ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ جمہور کے نمائندے، اکیاون فیصد آراء سے جس قسم کا قانون چاہیں بنالیں۔ لیکن قُرآنی مملکت میں اکیاون تو ایک طرف، اگر سو کے سو ارکان بھی چاہیں تو اُن غیر متبدل اصولوں میں جن کی طرف اوپر اشارہ کیا گیا ہے کسی قسم کا رد و بدل نہیں کر سکتے۔ اس مملکت کا مقصود و منتہیٰ ان غیر متبدل اصولوں کا تحفظ اور ان کی عملی تنفیذ ہے۔ یہی اس مملکت کے وجود (EXISTENCE) کی وجہء جواز (JUSTIFICATION) ہے۔ ان اصولوں کو مستقل اقدار یا (PERMANENT VALUES) کہتے ہیں۔ یہ اصول و اقدار قرآن کریم میں واضح، بین، مکمل اور محفوظ شکل میں دے دیئے گئے ہیں۔ اسلامی مملکت وہ ہے جو ان مستقل اقدار کو اپنا نصب العین قرار دے۔ جو آئین ان اقدار کے تحفظ کی ضمانت دے گا اسے اسلامی آئین کہا جائے گا۔ یہ اصول یا اقدار وحدود (BOUNDARY LINES) ہیں جن کے اندر رہتے ہوئے اسلامی مملکت اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق قوانین وضع کر سکتی ہے۔ یہ اصول ہمیشہ غیر متبدل رہیں گے۔ لیکن ان کی چار دیواری کے اندر جو قوانین مرتب ہوں گے وہ زمانہ کے تقاضوں کے ساتھ بدلتے رہیں گے۔ اسلامی معاشرہ اسی ثبات و تغیر (PERMANCE AND CHANGE) کے حسین امتزاج کا مظہر ہوتا ہے۔ كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ اَصْلُهَا ثَابِتٌ وَّفَرْعُهَا فِي السَّمَآءِ ﴿۲۴﴾ (14:24) اسی خوشگوار اور تناور درخت کی طرح جس کی جڑیں پاتال میں اپنی جگہ پر قائم ہوں اور شاخیں فضا کی پہنائیوں میں جدھر مناسب سمجھیں پھیل جائیں، یا اس پرندے کی طرح جس کی کیفیت یہ ہو کہ

پرد در وسعتِ گردوں یگانہ نگاہِ اُو بسوئے آشیانہ

دینی مملکت کے اس بنیادی اصول کی حیثیت، اس مرکزی نقطہ (CENTRE) کی سی ہے کہ اگر پرکار کا پاؤں اس پر جما رہے تو زندگی کا دائرہ ٹھیک کھنچتا چلا جائے لیکن اگر اس کا پاؤں اس نقطہ سے ذرا بھی اِدھر اُدھر ہٹ جائے تو سارا دائرہ بگڑ جائے۔

غیر متبدل اُصول:

اس مقام پر آپ کے دل میں لازماً یہ سوال پیدا ہوگا کہ وہ غیر متبدل اصول یا اقدار کیا ہیں جو اسلامی مملک اور اس کے آئین کی بنیاد بنتے ہیں۔ ان اقدار کے تفصیلی بیان کے لئے کافی وقت چاہئے۔ اس وقت میں (مثال کے طور پر) صرف چند اقدار کا مختصر سا تعارف کرانے کی کوشش کروں گا جس سے آپ اندازہ کر سکیں گے کہ ان اصول و اقدار کی نوعیت کیا ہے۔

انسانی زندگی کا ایک تصور تو یہ ہے کہ انسان عبارت ہے اس کے طبیعی جسم (PHYSICAL) سے جو مادی قوانین کے مطابق وجود میں آتا ہے۔ انہی قوانین کے مطابق جسم کی مشینری چلتی رہتی ہے اور جب یہ مشینری بند ہو جاتی ہے تو اس کے جسم کے ذرات منتشر ہو جاتے ہیں۔ اسی کا نام موت ہے، جس سے اس فرد کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ انسانی زندگی کے متعلق اس تصور کو مادی یا میکانیکی تصور (MATERIALISTIC CONCEPT OF LIFE) کہا جاتا ہے۔

انسانی ذات:

زندگی کا دوسرا تصور یہ ہے کہ انسان صرف اس کے جسم سے عبارت نہیں۔ جسم کے علاوہ ایک اور شے بھی ہے جسے انسانی ذات (PERSONALITY) یا خودی یا (SELF) کہا جاتا ہے۔ انسانی ذات نہ مادی ارتقاء کی پیداوار ہے نہ طبیعاتی قوانین کے تابع۔ یہ ہر فرد کو خدا کی طرف سے ملتی ہے لیکن غیر نشوونما یافتہ (UNDEVELOPED) مضمر (POTENT) یا امکانی (REALISEABLE POSSIBILITY) کی شکل میں، زندگی کا مقصود انسانی ذات کی نشوونما ہے۔ اگر اس کی مناسب نشوونما ہو جائے تو یہ جسم کی موت کے ساتھ فنا نہیں ہو جاتی بلکہ بدستور زندہ رہتی اور مزید ارتقائی منازل طے کرنے کے لئے آگے بڑھتی ہے۔

جس طرح جسم کی پرورش کے لئے طبیعاتی قوانین ہیں، اسی طرح انسانی ذات کی نشوونما کے لئے بھی قوانین مقرر ہیں۔ یہ وہی قوانین ہیں جنہیں قُرآن کے غیر متبدل اصول یا مستقل اقدار کہا جاتا ہے۔ اگر انسان ان اصولوں کے مطابق زندگی بسر کرے تو اس کی ذات کی نشوونما ہوتی چلی جاتی ہے۔ اگر وہ ان سے انحراف برتے تو اس کی ذات میں ضعف وانتشار پیدا ہو جاتا ہے۔ لیکن انسان ان اصولوں کیمطابق انفرادی طور پر زندگی بسر نہیں کر سکتا۔ یہ صرف معاشرہ کے اندر رہتے ہوئے، اجتماعی طور پر ممکن ہے، مملکت اسی اجتماعی زندگی کی تعبیر ہوتی ہے۔ لہذا اسلامی مملکت اس لئے وجود میں آتی ہے کہ افراد کے جسم اور ان کی ذات کے نشوونما کا ذریعہ بنے۔ مملکت مقصود بالذات نہیں، اس مقصد کے حصول کا ذریعہ ہے۔

لہٰذا، سب سے پہلی مستقل قدر خود انسانی ذات ہے۔ اس قدر کو مرکزی حیثیت حاصل ہے باقی اقدار اس کے گرد گردش کرتی ہیں۔ یہی وہ بنیاد ہے جس پر دین کی عمارت استوار ہوتی ہے۔ اگر کوئی شخص اس خدا کو مانتا ہے جس نے کارگہ کائنات کو پیدا کیا اور جس کے قوانین کے مطابق یہ عظیم الشان سلسلہ اس حسن وخوبی سے چل رہا ہے لیکن وہ انسانی ذات پر یقین نہیں رکھتا تو قرآن کی رُو سے اس کا خدا کو ماننا کچھ معنی نہیں رکھتا۔ انسان کا اپنی ذات پر ایمان، خدا پر ایمان کی بنیادی شرط (PRE-REQUISITE CONDITION) ہے۔

احترامِ آدمیت:

انسانی ذات اپنی انفرادیت (INDIVIDUALITY) رکھتی ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہر فرد اپنے اعمال کا آپ ذمہ دار ہوتا ہے اور ان اعمال کا خوشگوار یا ناخوشگوار نتیجہ خود بھگتتا ہے۔ وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰی ۚ (6:164) اس کا بنیادی اصول ہے۔ یعنی کوئی بوجھ اٹھانے والا کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا۔ انسان کو اس کے اعمال کے نتیجے سے نہ کسی کو سفارش بچا سکتی ہے نہ وہ کسی قسم کا فدیہ دے کر اپنی جان بچا سکتا ہے۔ لَّا تَجْزِیْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ شَیْـًٔا وَّلَا یُقْبَلُ مِنْهَا شَفَاعَةٌ وَّلَا یُؤْخَذُ مِنْهَا عَدْلٌ وَّلَا هُمْ یُنْصَرُوْنَ (2:48) اسلامی مملکت میں معاوضہ یا مؤاخذہ کا تعین اسی غیر متبدل اصول کے مطابق ہوتا ہے۔ چونکہ انسانی ذات ہر فرد کو خدا کی طرف سے یکساں طور پر عطا ہوئی ہے اس لئے ہر انسانی بچہ محض انسانی بچہ ہونے کی جہت سے واجب التکریم ہے، وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِیْۤ اٰدَمَ (17:70) قرآن کا وہ غیر متبدل اصول ہے جسے ساری دنیا مل کر بھی بدل نہیں سکتی۔ ایک بچہ شہنشاہ کے محل میں پیدا ہو یا چمار کی جھونپڑی میں، اس مستقل قدر کی رُو سے دونوں یکساں طور پر واجب التکریم ہیں۔ ان میں امیر و غریب کے علاوہ، نہ کالے اور گورے کی تمیز ہے نہ کافر و مومن کی تفریق۔ نہ وطن اور نسل کا کوئی امتیاز ہے، نہ زبان اور بود و ماند کی کوئی خصوصیت۔

آدمیت احترامِ آدمی است

قرآن کا بنیادی اصول ہے۔ جو آئین یا قانون اس بنیادی قدر کی حفاظت کرے گا وہ اسلامی کہلائے گا۔ جو اس سے متصادم ہوگا وہ غیر اسلامی قرار پا جائے گا۔

تعینِ مراتب:

پیدائش کی رُو سے بنیادی تکریم کے بعد قرآن کا فیصلہ یہ ہے کہ وَلِكُلٍّ دَرَجٰتٌ مِّمَّا عَمِلُوْا ؕ (6:132) ہر شخص کے مدارج و مراتب اس کے ذاتی جوہر اور کام کے لحاظ سے متعین ہوں گے۔ اس میں حسب و نسب، دولت، تعلقات یا اضافی اثرات کا کوئی لحاظ نہیں ہوگا۔ اسی اصول کو آگے بڑھاتے جائیں گے تو اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰىكُمْ (49:13) کی منزل سامنے آ جائے گی۔ یعنی سب سے زیادہ واجب التکریم وہ ہوگا جو قوانین خداوندی کا سب سے زیادہ پابند ہوگا۔ یعنی جس کی زندگی ان مستقل اقدار پر سب سے زیادہ پوری اُترے گی۔

غلامی:

تکریم آدمیت کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ کوئی انسان کسی کا غلام نہ ہو۔ لہٰذا غلامی (SLAVERY) قرآن کی رو سے انسانیت

کا بدترین جُرم ہے۔ غلامی تو ایک طرف رہی، قرآن کا ارشاد یہ ہے کہ کسی انسان کو اس کا حق حاصل نہیں کہ وہ دوسرے انسان سے اپنا ذاتی حکم منوائے۔ مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ (3:79) کسی انسان کو اس کا حق نہیں پہنچتا کہ خدا اسے ضابطہ قوانین، حکومت اور نبوت عطا کرے اور وہ دوسرے لوگوں سے یہ کہے کہ تم خُدا کے قوانین کی نہیں بلکہ میری محکومیت اختیار کرو۔ لہٰذا اسلامی مملکت میں اطاعت صرف قانون کی ہوگی۔

قانون کی اطاعت:

اُس قانون کی جس کی عمارت قرآن کے غیر متبدل اصولوں پر استوار ہوگی۔ ان قوانین کا اطلاق ہر فرد پر یکساں طور پر ہوگا اور اس میں کسی بڑی سے بڑی شخصیت کی بھی استثناء نہیں ہوگی۔ قرآن نے نبی اکرم ﷺ کی زبانِ مبارک سے یہ اعلان کرایا ہے کہ ''اَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِيْنَ'' (6:163) میں سب سے پہلے قانونِ خداوندی کے سامنے سرِ تسلیم خم کرتا ہوں۔

عدل

قانون کے یکساں طور پر اطلاق کا نام عدل ہے، عدل کے متعلق قرآن جس شدت سے تلقین کرتا ہے اس کا اندازہ اس سے لگائیے کہ اس کا حکم ہے کہ: وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓى اَلَّا تَعْدِلُوْا ؕ اِعْدِلُوْا ۟ هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى ۫ (5:8) کسی قوم کی دشمنی تمہیں اس پر آمادہ نہ کردے کہ تم ان سے عدل نہ کرو۔ ہمیشہ عدل کرو کہ یہی چیز تقویٰ کا تقاضا ہے۔

احسان:

عدل کے یہ معنی ہیں کہ جو کچھ کسی کا واجب (DUE) ہو اسے دیدیا جائے۔ لیکن قرآن نے عدل کے ساتھ احسان کا بھی ذکر کیا ہے، اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ (16:90) احسان کے معنی ہیں حسن پیدا کرنا اور حسن نام ہے صحیح توازن وتناسب (PROPORTION) کا۔ جس کا توازن بگڑ جائے اس میں حسن باقی نہیں رہتا۔ قرآن کا حکم یہ ہے کہ جس شخص کا کسی کمی کی وجہ سے توازن بگڑ رہا ہو، اس کی اس کمی کو پورا کردو تاکہ اس فرد کا (اور اس طرح افراد کے مجموعہ یعنی پورے معاشرہ کا) حسن قائم رہے۔ یہ بھی قرآن کا غیر متبدل اصول ہے جس پر اس کے نظام ربوبیت کی انسانیت ساز عمارت استوار ہوتی ہے۔ اسلامی مملکت کا فریضہ یہ ہے کہ وہ تمام افراد معاشرہ کی بنیادی ضروریاتِ زندگی بہم پہنچائے اور ان کی مضمر صلاحیتوں کی نشوونما کا ایسا انتظام کرے جس سے ہر فرد یکساں طور پر متمتع ہو سکے۔ بالفاظِ دیگر مملکت میں رہنے والے بچوں کی جسمانی، ذہنی اور قلبی نشوونما ان کے والدین کی ذمہ داری نہیں ہوگی بلکہ خود مملکت کی ذمہ داری ہوگی اور اس میں کسی قسم کا امتیازی سلوک (DISCRIMINATION) نہیں رکھا جائے گا۔

نظامِ ربوبیت:

اس سے ظاہر ہے کہ اگر کسی مملکت میں ایک فرد بھی رات کو بھوکا سو جائے درآنحالیکہ باقیوں کا پیٹ بھرا ہوا ہو، یا کوئی

بچہ ایسا رہ جائے جسے اس کی مضمر صلاحیتوں کی نشوونما کے لئے ضروری وسائل میسر نہ آ سکیں، تو وہ مملکت اسلامی نہیں کہلا سکتی۔ حضرت عمرؓ نے تو اس باب میں یہاں تک کہہ دیا تھا کہ اگر دجلہ کے کنارے ایک کتا بھی بھوک سے مر گیا تو خدا کی قسم عمرؓ سے اس کی باز پُرس ہوگی۔ اسلامی مملکت، اس نظامِ ربوبیت کا تجربہ پہلے اپنے حدود کے اندر کرے گی۔ اور اس کے بعد اس کا سلسلہ وسیع سے وسیع تر کرتی چلی جائے گی۔ حتیٰ کہ: ''وَاَشْرَقَتِ الْاَرْضُ بِنُوْرِ رَبِّهَا'' (39:69) یہ پوری زمین اپنے نشوونما دینے والے کے نور سے جگمگا اٹھے۔ یہ مملکت جن افراد کی پرورش کا ذمہ لے گی اُن سے کہہ دے گی کہ: لَا نُرِيْدُ مِنْكُمْ جَزَآءً وَّلَا شُكُوْرًا (76:9) ہم تم سے نہ کسی معاوضہ کے خواہاں ہیں نہ شکریہ کے متمنی۔ یہ ہمارا فریضۂ حیات ہے جسے ہم نے ادا کر دیا۔ اس میں صلہ اور معاوضہ کا کیا سوال؟

بہائے درد والم ، درد وغم کی لذت ہے وہ ننگِ عشق ہے جو آہ ہو اثر کے لئے

عالمگیر انسانیت:

اپنی مملکت سے باہر کے افراد کی پرورش کا جذبہ محرکہ، نہ سیاسی استعمار ہوگا نہ اپنی سلطنت کے استحکام کے لئے زیادہ سے زیادہ حلیف پیدا کرنے کی ''مقدس آرزو'' یہ سب کچھ اس ایمان کی رُو سے ہوگا کہ تمام نوعِ انسان ایک عالمگیر برادری کے افراد اور ایک خاندان کے نفوس ہیں۔ كَانَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً (2:213) قرآن کا غیر متبدل اصول ہے۔

معیارِ قومیت:

یہ انسان کی تنگ نگہی اور ہوس پرستی ہے جس سے اس نے اس عالمگیر برادری کو قوموں اور وطنوں کی چار دیواری میں تقسیم کر کے وحدتِ انسانیہ کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے ہیں۔ قرآن کی رُو سے انسانوں کی تقسیم کا ایک ہی معیار ہے۔ جو لوگ قرآن کی متعین کردہ مستقل اقدار کو زندگی کا نصب العین بنانے کا اقرار کر لیں وہ ایک ملت کے افراد ہیں، عام اس کے کہ وہ کس نسل سے متعلق ہیں اور دنیا کے کس حصہ میں رہتے ہیں اور جو ان اقدار سے انکار کریں وہ دوسری پارٹی کے افراد ہیں خواہ وہ اپنی مملکت کے اندر ہی کیوں نہ رہتے ہوں۔ بالفاظِ دیگر، قرآن کی رُو سے قوم کی تشکیل، آئیڈیالوجی کے اشتراک کی بنا پر ہوتی ہے نہ کہ اشتراکِ وطن اور نسل کی بنیاد پر۔ لیکن اس کے معنی یہ نہیں کہ جو شخص اس معیار کے مطابق ملتِ اسلامیہ کا فرد نہیں بنتا وہ اسلامی مملکت کی ربوبیتِ عامہ سے محروم رہ جاتا ہے۔ ہرگز نہیں۔ قرآن نے جو حقوق و مراعات محض انسان ہونے کی جہت سے دی ہیں وہ تمام انسانوں کے لئے عام ہیں اور انہیں ہر فرد انسانی حق کے طور پر (AS OF RIGHT) طلب کر سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے کہا ہے کہ: فِيْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَّعْلُوْمٌ ۝ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ ۝ (25-70:24) ان کے مالوں میں ہر محتاج و محروم کا حق ہے جسے ان میں سے ہر ایک اچھی طرح جانتا ہے۔ اقوام و اوطان کی حدود سے بلند ہو کر، عالمگیر انسانیت کو پیشِ نظر رکھنے کا یہ وہ غیر متبدل اصول ہے جس کی رُو سے قرآن نے کھلے کھلے الفاظ میں کہہ دیا کہ یاد رکھو وَاَمَّا مَا يَنْفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الْاَرْضِ ط (13:17) دنیا میں دوام اور بقا صرف اس کام کے لئے ہے جو تمام نوعِ

انسانی کی منفعت کے لئے ہے۔ یہ بھی قرآن کا غیر متبدل اصول ہے۔ اقبال کے الفاظ میں:

عقلِ خود بیں غافل از بہبودِ غیر سودِ خود بیند نہ بیند سودِ غیر
وحیٔ حق بینندۂ سودِ ہمہ در نگاہش سود وبہبودِ ہمہ

❁❁❁❁❁

وحدتِ انسانیت کا فلسفہ:

اس مقام پر عزیزانِ من قرآنی حکمت کا ایک ایسا عظیم نکتہ سامنے آتا ہے جسے بیان کئے بغیر آگے بڑھنے کو جی نہیں چاہتا۔ قرآنِ کریم کی تعلیم کا نقطۂ ماسکہ وحدتِ خالق اور وحدتِ مخلوق ہے۔ وہ جس معاشرہ کی تشکیل چاہتا ہے اس کی بنیاد وحدتِ انسانیت کے اصول پر ہے۔ اس مقصد کے لئے وہ فرد کو تاکید کرتا ہے کہ وہ انفرادی زندگی بسر کرنے کی بجائے معاشرہ کا جزو بن کر رہے۔ معاشرہ میں وہ طبقاتی تقسیم پیدا ہونے نہیں دیتا۔ وہ پوری کی پوری اُمت کو ایک وحدت قرار دیتا ہے، پھر اُس امت کو تاکید کرتا ہے کہ وہ باقی اقوامِ عالم سے الگ تھلگ نہ رہے بلکہ اپنی تہذیب وتمدن کے حاصلات میں انہیں بھی شریک کرے۔ اس میں شبہ نہیں کہ وحدتِ انسانیت کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ اقوامِ عالم کا باہمی سیاسی تصادم اور معاشی کشاکش ختم ہوجائے۔ لیکن اس سے بلند تر مقصد اور بھی ہے۔ انسانی ارتقاء کا یہ ایک عجیب اصول ہے کہ اگر ایک قوم تہذیب وتمدن میں آگے بڑھ گئی ہے لیکن وہ اپنے تہذیبی اور ثقافتی حاصلات کو اپنے آپ تک محدود رکھتی ہے، تو اس کی ترقی ایک خاص حد پر جا کر رک جاتی ہے اور اس سے آگے بڑھ نہیں سکے گی۔ لیکن اگر وہ قوم اپنے علمی اور تہذیبی ماحصل کو دوسری قوموں تک بھی پھیلا دیتی ہے تو اس کا ارتقاء حدود فراموش ہوجاتا ہے۔ بالفاظِ دیگر (بریفالٹ کے ستعارہ کے مطابق) اگر تہذیبی ترقی غیر مہذب سمندر میں ایک جزیرہ کی طرح محدود ومقید رہتی ہے تو وہ ایک حد تک جا کر جامد اور متصلب (STAGNATED) ہو جاتی ہے۔ اسی طرح اگر ایک قوم کی معاشرتی حالت یہ ہے کہ اس میں تہذیب وتمدن کا حامل ایک خاص گروہ اور باقی افراد قوم کی ارتقائی سطح پست ہے تو اُس گروہ کا ارتقاء بھی ایک حد تک پہنچ کر رُک جائے گا۔ یہ وجہ ہے کہ قرآن، فرد کو جماعت کا جزو، اور جماعت کو پوری انسانیت کا جزو بناتا ہے۔ انہیں الگ الگ نہیں رہنے دیتا۔ اُس کی رُو سے متشکل شدہ جنت میں فرد انفرادی زندگی بسر کرنے سے داخل نہیں ہوتا۔ اُسے حکم دیا جاتا ہے فَادْخُلِيْ فِيْ عِبٰدِيْ ﴿۲۹﴾ وَادْخُلِيْ جَنَّتِيْ ﴿۳۰﴾ (89:29-30) تو میرے بندوں میں شامل ہوجا اور اس طرح جنت میں داخل ہوجا۔

اجتماعی جنت:

اُس جنت میں بھی یہ کیفیت نہیں ہوتی کہ اُس کا کچھ حصہ جنت ہ اور باقی حصہ جہنم۔ قرآن دنیا میں اسی قسم کی جنت متشکل کرنا چاہتا ہے۔ اس کی رُو سے رہبانیت (یعنی تصوف کے خلوت کدوں) کی زندگی اسی لئے غیر قرآنی ہے کہ اس میں ہر فرد اپنی روحانی ترقی کی فکر میں لگا رہتا ہے اور پورے معاشرے کو اس میں شامل نہیں کرتا۔ اسی طرح قرآن دنیائے سیاست میں اُس نہج کو

ارتقائے انسانیت کے منافی قرار دیتا ہے جس میں اقتدار واختیار کسی ایک طبقہ کی اجارہ داری بن کر رہ جائے اور باقی افرادِ قوم کی سطح اُس طبقہ سے نیچی ہو۔ اس سے آگے بڑھ کر وہ بین الاقوامی بساط پر اس روش کو خلافِ انسانیت قرار دیتا ہے جس میں ایک قوم عروج وارتقاء کی بلند ترین فضاؤں میں پرواز کر رہی ہو اور باقی اقوام عالم، بال وپر بریدہ پرندوں کی طرح خاک نشین ہو کر رہ جائیں۔

جحیم سے مراد:

وہ اسی ارتقاء کو وجہ شرف قرار دیتا ہے جس میں تمام افرادِ انسانیت برابر کے شریک ہوں۔ اگر ایسا نہ ہوگا تو تھوڑی دور چل کر اس آگے بڑھنے والی قوم کی ترقی بھی رُک جائے گی اور وہ بھی دیگر اقوام کی طرح جہنم میں پہنچ جائے گی۔ قرآن نے جہنم کے لئے عربی زبان کا لفظ جحیم استعمال کیا ہے جس کے معنی رُک جانے کے ہیں۔ جہاں کسی قوم کی ترقی رُک جاتی ہے وہی اُس کا ''جحیم'' ہے۔

مگر کوتاہیِ ذوقِ عمل ہے خود گرفتاری جہاں بازو سمٹتے ہیں وہیں صیاد ہوتا ہے

ارتقائے انسانیت کا یہ وہ راز ہے جس کی پردہ کشائی عصرِ حاضر کے مؤرخین تہذیب وتمدن کی تحقیقات کئے جارہی ہیں۔ لیکن ہمیں اس کے لئے کہیں باہر جانے کی ضرورت نہیں۔ ہمارے لئے تو شَاهِدٌ مِّنْ اَهْلِهَا ۚ (12:28) خود اپنے گھر کی شہادت کافی ہے۔ یعنی خود مسلمانوں کے عروج وزوال کی تاریخ اسی حقیقت کی مظہر ہے۔

ہمارے عروج وزوال کے اسباب:

جب سرزمینِ حجاز کے مٹھی بھر انسانوں نے قرآن کی اس حکمتِ بالغہ کو سمجھ لیا تو انہوں نے پہلے ایک ایسی جماعت تیار کی جس میں حاکم ومحکوم، بلند اور پست، امیر اور غریب، عربی اور عجمی کے تمام امتیازات مٹا کر انہیں اُمتِ واحدہ بنا دیا، جس کا بنیادی اصول یہ تھا کہ ایک فرد کی صلاحیتوں کے ماحصل اور محنت کی کمائی میں تمام افراد برابر کے شریک ہوتے ہیں۔ قرآن نے فاتحۃ الکتاب کے بعد پہلی سورت کی ابتداء میں ان افراد کی جو خصوصیات بتائی ہیں ان میں واضح طور پر کہا گیا ہے کہ: وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ (2:3) انہیں جو کچھ ہماری طرف سے ملتا ہے وہ اسے دوسروں کی بہبودی کے لئے کھلا رکھتے ہیں۔ اس کھلا رکھنے کی حد کیا ہے، اس کے متعلق آگے چل کر بتایا وَيَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ ۬ (2:219) یہ تجھ سے پوچھتے ہیں کہ ہم اپنی کمائی میں سے کس قدر حصہ دوسروں کے لئے کھلا رکھیں؟ قُلِ الْعَفْوَ ۭ (2:219) ان سے کہہ دو کہ جس قدر تمہاری ضروریات سے زاید ہے سب کا سب۔ اس کا تو انہیں حکم دیا گیا تھا، لیکن وہ عند الضرورت اس سے بھی آگے بڑھ جاتے تھے۔ وَيُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ ۭ (59:9) وہ خود تنگی میں گزارہ کرلیا کرتے تھے لیکن دوسروں کی ضروریات کو اپنے آپ پر ترجیح دیتے تھے۔

(جاری ہے)

محمد انوار خان، اسلام آباد

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لئے

24 اکتوبر 1945ء اس کرہ ارض پر بسنے والی مختلف اقوام کو متحد کرنے اور عالمی امن کے قیام کی غرض سے اقوام متحدہ کا قیام عمل میں لایا گیا فی الوقت اس کے 193 ممالک مستقل میمبرز ہیں جن میں 57 اسلامی ریاستیں بھی شامل ہیں۔ اقوام متحدہ کا سالانہ اجلاس اس کے ہیڈ کوارٹر واقع نیویارک امریکا میں منعقد ہوتا ہے اور ضرورت پڑنے پر ہنگامی اجلاس بھی بلایا جاتا ہے۔ اس ادارے کے قیام کا بنیادی مقصد دنیا کے تمام ممالک کے درمیان جذبہ خیر سگالی کا نفاذ تھا تاکہ دنیا میں پائیدار امن کا قیام عمل میں لایا جائے۔ لیکن اس ادارے کے قیام سے لیکر آج تک اگر دنیا میں رونما ہونے والے مختلف واقعات کا تقابلی جائزہ لیا جائے تو آن واحد میں اس بات کا اندازہ ہو جائے گا کہ اقوام متحدہ میں نصب انصاف کے ترازو کا پلڑا کس جانب جھکا ہوا ہے اور کن ممالک کے حق میں زیادہ تر فیصلے کیے جاتے ہیں اور کن ممالک کے حقوق کو بے دردی سے پامال کیا جاتا ہے۔ بالفرض محال ہم تمام گزشتہ واقعات کو پس پشت ڈال کے آگے بڑھ جائیں اور صرف موجودہ حالات کا جائزہ لیں تو ہمارے سامنے متعدد اسلامی ریاستوں کا نقشہ ابھر کر سامنے آجائے گا جن کے ساتھ جانتے بوجھتے ہوئے مسلسل ناروا سلوک برتا جا رہا ہے مثال کے طور پر عراق، ایران، شام، لبیا، کشمیر اور آج کل فلسطین ان کے نشانے پر ہے۔ دنیا کا کون سا ایسا ظلم ہے جو ان اسلامی ممالک کے ساتھ روا نہیں رکھا جا رہا۔ آج پوری دنیا بشمول غیر اسلامی ریاستیں بھی فلسطین میں ہونے والے مظالم پر سراپا احتجاج ہیں لیکن مجال ہے اقوام متحدہ کے کان پر جوں بھی رینگ جائے ماسوائے زبانی جمع خرچ کے۔ بڑی پرانی اور پر مغز مثال ہے جو ہم اپنے آباؤ اجداد سے بچپن سے سنتے چلے آرہے ہیں کہ گھٹنے ہمیشہ پیٹ کی طرف مڑتے ہیں اس کا عملی مظاہرہ آج ہم اپنی نگاہوں سے دیکھ رہے ہیں کہ اقوام متحدہ کے گھٹنے کس جانب مڑ رہے ہیں۔

البتہ او آئی سی (OIC) یعنی ''آرگنائزیشن آف اسلامک کوآپریشن'' 1969 میں قائم ہوئی۔ اس کا قیام مراکش کے شہر رباط میں ایک اسلامی کانفرنس کے بعد عمل میں آیا، جس کا مقصد مسلم دنیا کے مفادات کا تحفظ اور ان کے درمیان اتحاد و تعاون کو فروغ دینا تھا۔

او آئی سی کے رکن ممالک کی تعداد 57 ہے، اور یہ تمام ممالک مسلم اکثریتی یا مسلم آبادی رکھنے والے ہیں۔ بدقسمتی سے یہ آرگنائزیشن بھی عملی طور پر اپنا کردار ادا کرنے سے قاصر رہی۔

ستم بالائے ستم یہ کہ کوئی اسلامی مملکت OIC کے ہوتے ہوئے بھی اسرائیل کو اس کی درندگی کا منہ توڑ جواب دینے سے قاصر ہے تمام تر وسائل کی فراوانی کے باوجود اسلامی ممالک کے حکمرانوں کی ایک مجرمانہ خاموشی ہے جس میں روز افزوں اضافہ ہوتا دکھائی دیتا ہے۔ ہزاروں مرد خواتین اور معصوم بچوں کو بے دردی سے قتل کر دیا گیا اور امت مسلمہ معصومیت سے ایک دوسرے سے اپیل کر رہی ہے کہ اسرائیلی پراڈکٹس کا بائیکاٹ کیا جائے جس کا عملی مظاہرہ بھی برائے نام ہوتا دکھائی دیتا ہے۔

یہ ذوالحجہ کا مہینہ ہے تمام عالم اسلام سے لاکھوں فرزندانِ توحید کعبۃ اللہ کا طواف کرنے کے لیے حاضر ہو رہے ہیں ابھی گزشتہ ماہ رمضان المبارک میں تقریباً دو کروڑ پچاس لاکھ سے زائد زائرین پہلے دس دنوں میں وہاں موجود تھے اور ایک دن تقریباً پانچ لاکھ زائرین کعبۃ اللہ میں حاضر تھے ان تمام مسلمانوں نے کعبۃ اللہ میں قیام کے دوران روزے رکھے نماز تراویح ادا کی گڑا گڑا کر اللہ تبارک وتعالیٰ کے حضور دعائیں مانگی لیکن اس اجتماعی عبادت کا اثر امت مظلوم پر ہوتا ہوا دکھائی نہیں دیا۔

اللہ تبارک وتعالیٰ نے شاید اسی ذلت و رسوائی سے بچنے کے لیے آج سے تقریباً چار ہزار سال قبل اپنے خلیل حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ان کے بیٹے حضرت اسماعیل علیہ السلام کو مبعوث فرمایا اور باپ بیٹے کو کعبہ کی تعمیر کا حکم دیا اور سارے عالم میں منادی فرما دی کہ رہتی دنیا تک خدا کے نام لیوا اپنے تمام تر انفرادی اور اجتماعی مسائل کے حل کے لیے ہر سال اس گھر میں حاضر ہوں گے اور ہنگامی صورتحال سے نمٹنے کے لیے عمرہ کی ادائیگی کے ذریعے امت کو درپیش مسائل کا حل تجویز کریں گے۔ حاضرین کے لیے خصوصی ھدایت کی گئی تھی کہ عام لوگوں کی طرح تمام مسلم حکمرانوں کا لباس بھی دو چادریں ہوگا تاکہ کسی کے لباس سے اس کا طرزِ زندگی عیاں نا ہونا کوئی اعلیٰ دکھائی دے اور نا کوئی ادنیٰ کیونکہ جب یہ سارے مل کر طواف کعبہ ادا کریں گے اور سجدے کی حالت میں اپنی پیشانی خدا واحد کی چوکھٹ پر رکھیں گے تو مطلوب مومن صرف اور صرف اللہ تبارک وتعالیٰ کی حاکمیت اور وحدانیت ہوگا اور امت کے ایک ایک فرد کی دادرسی ان منتخب حکمرانوں کے ذریعے عمل میں لائی جائے گی۔

اقبال کا کیا خوبصورت انداز بیان ہے فرماتے ہیں:

ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لئے
نیل کے ساحل سے لے کر تابخاک کاشغر

ساتھ ہی دوسری جگہ فرمایا کہ:

ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود و ایاز
نا کوئی بندہ رہا اور نا کوئی بندہ نواز

جبکہ ارشاد خداوندی ہے

اِنَّ اَوَّلَ بَیۡتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِیۡ بِبَکَّۃَ مُبٰرَکًا وَّ ہُدًی لِّلۡعٰلَمِیۡنَ ﴿۹۶﴾ (3:96)

اِن کا دوسرا اعتراض یہ ہے کہ' قرآن نے 'بیت المقدس کی بجائے' کعبہ کو کیوں مرکز قرار دیا ہے؟ (142:2)۔ اِن سے

کہو کہ دنیا میں سب سے پہلے جس مقام کو نوعِ انسان کا مرکز تجویز کیا گیا تھا' وہ مکہ تھا۔ اسی مرکز سے' اقوامِ عالم کو ثبات و استحکام اور نشوونما کا سامان ملنا تھا' اور اسی کو وہ روشنی کا مینار بننا تھا جس سے عالمگیر انسانیت کے سامنے زندگی کا صحیح راستہ آسکے۔

چنانچہ اس عظیم مقصد کے حصول کے لیے جہاں ساری دنیا سے مسلمان حکمران اور ان کے رفقاء کار اکٹھے ہوں گے تو وہاں ان کے قیام و طعام کا بھی اہتمام ہوگا لہٰذا ذبح شدہ جانوروں کے گوشت سے مختلف انواع و اقسام کے کھانے پکائے جائیں گے تاکہ حاضرین ان سے لطف اندوز ہوں۔ امت مسلمہ کی خوشحالی کے لیے کاروباری شخصیات آپس میں ملاقاتیں کریں گی تاکہ تجارت کو فروغ حاصل ہو۔

لہٰذا اس مقام پر ارشاد خداوندی ہے جس سے حج کے موقع پر جانوروں کی قربانی کا مقصد بھی واضح ہو جاتا ہے:

لَنْ يَّنَالَ اللّٰهَ لُحُوْمُهَا وَلَا دِمَآؤُهَا وَلٰكِنْ يَّنَالُهُ التَّقْوٰى مِنْكُمْ ؕ كَذٰلِكَ سَخَّرَهَا لَكُمْ لِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ ؕ وَبَشِّرِ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۳۷﴾ (22:37)

اس حقیقت کو ایک مرتبہ پھر سمجھ لو کہ یہ جانور تمہاری ضروریات پورا کرنے کے لئے ہیں۔ یہی ان کے اس موقعہ پر ذبح کرنے سے مقصود ہے) اللہ تک ان کا گوشت اور خون نہیں پہنچتا۔ اُس کے ہاں تو صرف یہ دیکھا جاتا ہے کہ تم اس کے قوانین کی کس حد تک نگہداشت کرتے ہو۔ اس نے ان جانوروں کو تمہارے لئے مسخر کر دیا ہے تاکہ تم (اپنی طبیعی ضروریات کی طرف سے بے فکر ہو کر) خدا کے اس ضابطہ قوانین کو' جس سے اس نے تمہاری راہ نمائی کی ہے' دنیا کے تمام قوانین و ضوابط پر غالب آسکو (185:2) جو لوگ اس طرح' قوانین خداوندی کے مطابق' حسن کارانہ انداز سے زندگی بسر کریں گے' ان کے لئے نہایت خوشگوار نتائج کی بشارتیں ہیں۔

چنانچہ مندرجہ بالا طرزِ عمل کو جس کا آغاز حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ان کے بیٹے حضرت اسماعیل علیہ السلام نے کیا تھا بعد ازاں بھی جاری و ساری رہنا تھا کیونکہ حضرت آدم علیہ السلام سے لیکر ختم الرسل حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تک اللہ تبارک وتعالیٰ کا پیغام تو ایک ہی ہے کہ دنیا میں قوانین خداوندی کے احکامات کی تعمیل کی جائے اور ان کا نفاذ ہو۔ قربان جایئے اور سلام بھیجیے حضرت محمد صلی اللہ علیہ السلام کی ذاتِ مبارکہ پر جنہوں نے وحی الٰہی کے اس عظیم پیغام کے ذریعے ان تمام ناممکنات کو ممکن کر دکھایا۔ تاریخ کے اوراق گواہ ہیں کہ عرب کا وہ ریگستان جہاں آئے دن انسانیت سوز جرائم کا ارتکاب ہوا کرتا تھا آپ کی ولولہ انگیز قیادت نے اس قطعہ اراضی کو جنت نظیر وادی میں تبدیل کر دیا۔ اور اس امر کو یقینی بنایا کہ زمین کی ملکیت صرف خدا وحدہ لاشریک کی ہوگی اور اس سے حاصل ہونے والا اناج تمام انسانوں میں برابری کی بنیاد پر تقسیم ہوگا عدل و انصاف ہر شخص کو اس کی دھلیز پر فراہم کیا جائے گا اس طرح باہمی رواداری، اخوت و مساوات کا نظام قائم کر کے دنیا کو دکھا دیا جس کی اس سے قبل کوئی نظیر نہیں ملتی۔

مگر شومئ قسمت بعد ازاں ملوکیت اور مذہبی پیشوائیت نے ملکر ظلم و جبر اور استبداد پر مبنی وہ قوانین مرتب کیے کہ اللہ کی پناہ۔ امت کو فرقوں میں تقسیم در تقسیم کرنے کے لیے ثواب و عذاب پر مبنی روایات وضع کیں جن کو تا قیامت مٹایا نہیں جا سکتا تاوقتیکہ ہر مومن مسلمان خود آگے بڑھے اور دل جمعی سے قرآن حکیم کا مطالعہ کرے لغت القرآن اور تصریف آیات کی مدد سے

اس کو سمجھے سمجھائے اور اپنے مثبت عمل سے ثابت کرے کہ یہی حکم خداوندی ہے اور اسی میں ہم سب کی نجات ہے۔ تقریباً ہر سال پچیس چھبیس لاکھ عازمین حج مکہ مکرمہ کا رخ کرتے ہیں اس تصور کے ساتھ جیسا کہ ان کو بتایا گیا ہے کہ حج کی ادائیگی کے بعد وہ گناہوں سے ایسے پاک ہو جائیں گے جیسے ابھی اپنی ماں کی کوکھ سے جنم لیا ہو۔ یہ لاکھوں فرزندانِ توحید حج کی ادائیگی کے بعد جب اپنے اپنے علاقوں میں جاتے ہیں تو کیا ان ممالک میں دودھ اور شہد کی نہریں بہنا شروع ہو جاتی ہیں کرپشن، چور بازاری کے دروازے بند ہو جاتے ہیں؟ قتل و غارتگری ختم ہو جاتی ہے؟ بڑی معذرت کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ ایسا بالکل نہیں ہوتا البتہ کچھ عرصہ کے لیے حاجی صاحب اپنے آپ کو دیگر افراد کی نسبت زیادہ معتبر سمجھنا شروع کر دیتے ہیں جس سے معاشرے میں بہتری کے بجائے مزید تنزلی پیدا ہو جاتی ہے۔ ذرا سوچئے تو صحیح اگر مسلمان ممالک کے سربراہان حج کے موقع پر موجود ہوتے اور اپنے اپنے ممالک کے جھنڈے تلے اپنے لوگوں کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر چلتے اور ان کی بھلائی کے لیے کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کرتے تو آج صورتحال یکسر مختلف ہوتی۔ مگر بدقسمتی سے مسلمانوں نے سوچنا سمجھنا ہی چھوڑ دیا صرف رسومات کی ادائیگی کو ہی اپنا نصب العین بنا لیا جس کے بدترین نتائج ہمارے سامنے ہیں اور ہم ہیں کہ تماشائی بنے یہ سب تماشا دیکھ رہے ہیں اور اس سے بھی بڑھ کر تلخ حقیقت یہ کہ اس کو رضا الٰہی سمجھ کر برداشت کئے جا رہے ہیں۔

جیسا کہ مندرجہ بالا سطور میں بیان کیا جا چکا ہے کہ حج بیت اللہ کا بنیادی مقصد اقوام متحدہ کی طرز پر اسلامی ممالک کا اتحاد قائم کرنا تھا اگر ایسا ہو جاتا تو صورت حال آج یکسر مختلف ہوتی۔ قرآن کریم اس امر کا اعتراف چودہ سو سال قبل کر چکا ہے۔ ارشاد خداوندی ہے کہ:

يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ اِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ رُسُلٌ مِّنْكُمْ يَقُصُّوْنَ عَلَيْكُمْ اٰيٰتِيْ ۙ فَمَنِ اتَّقٰى وَاَصْلَحَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۝ (7:35)

اِس کے متعلق ہم نے' انسان کی تمدنی زندگی کی ابتداء ہی میں' بذریعہ وحی کہہ دیا تھا کہ تمہاری طرف ہمارے پیغامبر آئیں گے جو ہمارے قوانین تم تک پہنچائیں گے۔ سو جو لوگ بھی ان قوانین کی نگہداشت کریں گے اور زندگی اور کائنات کو سنوارنے والے کام کریں گے' ان کے لئے کسی قسم کا خوف وحزن نہیں ہوگا۔

اللہ تبارک وتعالیٰ کے احکام کی تعمیل نا کرنے کا خمیازہ آج پوری امت مسلمہ اٹھا رہی ہے۔ مسلم ریاستوں کو خوف بھی ہے اور ان میں حزن بھی موجود ہے کیونکہ کوئی اسلامی ریاست اپنی مرضی کے فیصلے خود نہیں کر سکتی معمولی نوعیت کے فیصلوں کے لیے بھی ان کو غیر مسلم طاقتوں کا منہ دیکھنا پڑا ہے کیونکہ ان کی مرضی کے بغیر تو یہ سانس بھی نہیں لے سکتے۔

آخر میں اللہ تبارک وتعالیٰ کی بارگاہ میں دعا گو ہوں کہ مجھ گنہگار کو اور امت مسلمہ کو اور بلخصوص پاکستان میں بسنے والے چوبیس کروڑ مسلمانوں کو قرآن حکیم کو اس طرح پڑھنے اور سمجھنے کی توفیق عطا فرمائے جس طرح خاتم النبیین حضرت محمد ﷺ نے ہمیں اپنے عمل سے سکھایا تھا اور جس کے نفاذ کی خاطر میرے پیارے نبی ﷺ اور آپ کے رفقاء کار نے وہ عظیم قربانیاں دیں جو شاید ان سے پہلے آنے والے انبیاء کرام بھی نا دے سکے تھے۔

Manzil ba Manzil **(منزل بہ منزل)**

Chapter 4: Builder of Kaaba (*Mei'mar Haram* - معمارِ حرم) –

To leaders of Spring's caravan

(Tulu-e-Islam Convention, April, 1960) Episode No. 2

By G. A. Parwez (Translated by: M. Alam)

But you can see how this strategy of Iblis is failing. No one is interested to hear nowadays whether "*the son of Marry is dead, or is he eternally alive?*" So, from the pulpits you won't hear such things now. The world wants real solutions to life's practical problems which can only be found in the Quran. That is why even the Mullah finds himself forced to talk about the Quran in his sermons from the pulpit. Just hear the sermons of different mosques. You will find that almost every speaker will be using abusive language against the Tulu-e-Islam but the content of the sermon will be mostly based on some article of Tulu-e-Islam. So, why do they use abusive language against Tulu-e-Islam while using its content? This is because their narcissistic ego and false pride does not allow them to accept the reality. In the words of the Quran: وَاِذَا قِيْلَ لَهُ اتَّقِ اللّٰهَ اَخَذَتْهُ الْعِزَّةُ بِالْاِثْمِ فَحَسْبُهٗ جَهَنَّمُ (2:206) – When they are asked to abide by the Divine Laws, their power-intoxication and false pride impels them towards greater destruction. But they have become used to deriving all the benefits from using the name of the Quran. So they keep doing it because people have deep affection for the Quran. But these Mullahs do not muster the courage to openly submit to the Quran's true message because that affects their religious profession:

The Sheikh stopped and looked around;
Then bowing his head entered the tavern!

Still better way to put it is:

Modesty heard and eyes became intoxicated;
Pious one came to the wine party unexpected!

But my dear friends, this does not mean that you should take it easy if the demand of the times is knocking out the darkness of religion. Not at all? On the contrary, this is the time for you to double your effort. See! How beautifully and pithily the Quran puts this: مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْعِزَّةَ فَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ جَمِيْعًا ؕ اِلَيْهِ يَصْعَدُ الْكَلِمُ الطَّيِّبُ وَالْعَمَلُ الصَّالِحُ يَرْفَعُهٗ ؕ (35:10) – Therefore if any nation desires to regain life with power, strength, superiority and respect, it should keep in mind that all this can only be achieved by following Divine Laws. The nation should also keep in mind the fundamental reality that in order to achieve further development and ascendancy towards greater heights, two things are important: 1) to have an ideology or concept of life which has the inherent capacity to grow, flourish and achieve pleasant results; and 2) righteous deeds which help lift this ideology skywards. Divine Guidance has the capability to continue growing

without any external support. However its speed is very slow compared to human scale – Allah's one day may be as long as fifty thousand years; but it speeds up when it is supported by human deeds.

An observer starts saying:

One giant step of deep passion ended the story abruptly;
I held that the Earth and heaven were stretched infinitely!

So, O torch bearers of the Quranic message in this dark period! Step forward. Signs towards the Quranic destination have started appearing. The world is waiting to hear the real message of the Quran. Make sure you do not get tired and stop for respite. Otherwise, you will feel sorry for why you stopped when the world was eager to listen to your message:

When the world was listening intently to us;
We ourselves slept in the middle of the story!

In your awakening my friends, there is secret for awakening of humankind. Therefore: قُمْ فَأَنْذِرْ ۝ وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ ۝ وَثِيَابَكَ فَطَهِّرْ ۝ وَالرُّجْزَ فَاهْجُرْ ۝ (74:2-5) – Arise and warn the slumbering people of the outcome of their erroneous ways of life. And establish the Order of universal sustenance so that it manifests the sovereignty of your Sustainer and shows that all greatness should only belong to Him. You too will thus attain eminence in the world. To achieve this it is very important that you purify your own conduct, character and personality; and that you keep this mission free from every kind of undesirable element. This system cannot be operated mechanically by anyone. The mission should be clean and transparent; and the vision and character of all those who participate in it should be pure. Take such companions with you and give them the training that would inculcate strength in their personalities, with which they can undertake this big responsibility with ease. They should not tremble when they are asked to rise up bearing this heavy responsibility.

We saw an example in the last convention how the demands of time are bringing the world closer and closer to the Quran and how the custodians of religion have to bow down before them. This was about the popular support for the recent land reform legislation and we saw how the religious establishment could not raise its obscurantist voice against it because despite their belief in unfettered capitalism and unlimited land ownership. This year the government has reformed a sharia law pertaining to inheritance that is now closer to the Quran. In the sharia law an orphan child cannot get any share from his deceased father's inheritance if the grandfather is still alive. The sharia also openly allows a husband marrying four wives; and gives sole authority of divorce to the husband. The wife is completely helpless in this regard. These laws have been instrumental in spreading corruption and grief in the society.

But due to popular opposition of these anti-Quran laws, the law-commission proposed reforms in these family related sharia laws as well. Although these proposed laws are not all exactly according to the Quran but they are definitely closer to it than the traditional sharia laws. And the government has accepted these laws and these will be given legal status making life easier for a vast majority of people who are suffering under weight of the current traditional sharia laws. We congratulate the government for this reform and request that it should continue to move toward the Quranic laws. We also hope that it never enacts any laws that are against the Quran. Therefore, this message must be communicated to the law-commission: that only that law could be called Islamic which is in accordance with the Quran.

***

Organization of Tulu-e-Islam movement

Now, my brothers, I want to say something about our movement. As I have been saying all along, this movement has nothing to do with any religious or political party. This is an organized effort to spread the Quranic thought. As for the Quranic thought that is presented here, if you accept it because it is my thought – i.e., your authority is that Parwez is saying this – then please remember! You have neither understood the Quran nor this movement. The authority for Quranic thought cannot be Parwez nor any other human being. I present the Quran according to my understanding. It is your duty to critically examine my explanation of the Quran and then come to your own conclusion with your own mind to see whether or not my explanation is right. If you agree then it is your own understanding of the Quran directly on the basis of the authority of the Quran, not my authority. Please listen again: the day you make any human as an authority in the دین (*Deen*) instead of the Quran, then you laid the foundation of sectarianism that day. And you already know that creating sect in دین (*Deen*) is شرک (*Shirk*) according to the Quran.

Those friends who, after due thought and understanding like this, find the message presented by Tulu-e-Islam as right form a collective unit called Bazm-e Tulu-e-Islam, whose purpose is to collaborate and coordinate their effort in an organized form to spread the Quranic thought presented by Tulu-e-Islam. It is necessary for the members of the Bazms to have loving and amicable relationships with each other. Their life should be a living example of رُحَمَآءُ بَيۡنَهُمۡ (48:29) – they are kind hearted and sympathetic amongst themselves. This is only possible if they trust each other. The unity of goal creates this type of trust. It is necessary for you not to give importance to trivial differences related to this organized effort. Don't insist on your opinion to be accepted by others. Try to embrace others as much as possible in your heart.

Remember that these individual pearls of the thread have been collected with great effort. Don't try to break the thread of this bond.

But please remember! There is no point in keeping someone with you who does not agree with the Quranic thought presented by Tulu-e-Islam. Your organization is completely different from the organization of the political parties. The strength of political lies in the numbers of its members. That is the reason these parties try to do everything possible to keep their members within the party. But your organized effort is based on harmony of thought. So, if a person is not fully committed with all his heart to spread this message then there is no point in keeping him within your organization. But, on the other hand, if the Quran has entered in someone's heart, and for emergent emotional reason this person has left you, then sooner or later he will come back:

Those leaving due to some excuse;
Will come back to you somehow!

This is because he won't receive such companionship as you offer to him. However, if there is anyone, in whose heart the Quran has not entered, you cannot compel him to stay with you.

There is no control in love; because it lights an inner fire Ghalib;
It can't be lit from outside nor can it be extinguished from outside!

But you should continue your efforts so that the inner fire that is burning in your heart may also start a fire in his heart as well.

Day of accountability

My dear friends, there is one more important question worth pondering. You gather every year in these conventions. The question is: what is the purpose? There is no doubt that people benefit from exchanging ideas; that they benefit from networking and creating bonds of friendship; that they benefit from understanding the Quranic perspective on various aspects of life. These are very laudable objectives. But the basic goal of these conventions is something else – which is that these conventions serve as a Day of Accountability or یوم الحساب (*Yaumul Hisaab*). This means you have to assess yourself. You have to assess: to what extent the decision made at the prior convention has been achieved; to what extent the program action that was decided upon has been given practical shape; that to what extent the agenda that was agreed upon has been completed. If you did this kind of accountability then you accomplished the goal of the convention. If you didn't do this then this gathering is no more than a crowd of believers. If after the accountability, if you moved one step ahead with program of action then you will be counted among live human beings, and our destination will get nearer. And we can be hopeful that we will reach our destination one day: ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْمُبِيْنُ (45:30) – This will obviously be a

great achievement! On other hand, if we see that we are standing at the same place that we were standing last year – then this will be like the state of lifeless stones, not the state of living human beings. There is no difference between being static and being dead. In the words of Allama Iqbal:

Incessantly moving ahead is sign of life;
Remaining in the same state is not life;
If your tomorrow is the same as today;
You are only clay without the fire of life!

But, God forbid, if you are in a state of life which is behind compared to last year – then the Quran's judgment is: ثُمَّ رَدَدْنٰهُ اَسْفَلَ سٰفِلِيْنَ (95:5) – Then We return him to the lowest of the low state. What can we say about such a state except to say?

Ask his heart and soul whose destination today;
Is far farther than what it was only yesterday?

Therefore my dear friends, do your accountability in this gathering. And find out from the Quran whether you are to be counted among the live human beings or among the dead stones or the lowest of the low. In fact, you should do this accountability at every step of your way. Life in fact means that one should incessantly engage in accountability. If you don't do what you say you will do then you are doing poetry with life: وَاَنَّهُمْ يَقُوْلُوْنَ مَا لَا يَفْعَلُوْنَ (26:226) – And the biggest difference is that their own lives are not according to what they say. They themselves do not act upon their own words. But more serious than this will be your warped psychological condition if you want praise for something that you don't do: وَّيُحِبُّوْنَ اَنْ يُّحْمَدُوْا بِمَا لَمْ يَفْعَلُوْا (3:188) – They like to be praised for what they did not do.

My dear friends, if this is the case then it is self-deception as well as God-deception. This must not be the case with an organization which claims to spread the Quran's message. The proof of the claim of its message should be the living results of its deeds. Please remember! In the scale of Allah the weight is of deeds not of talks. Simply talking is nothing but poetry which is unbecoming of a caller to a revolutionary message. The reality of this is the proclamation of the Quran: وَمَا عَلَّمْنٰهُ الشِّعْرَ وَمَا يَنْۢبَغِيْ لَهٗ (36:69) – We neither taught such poetry to Our Messenger, nor is it worthy of a person who has been assigned to deliver such a revolutionary and vital message.

So, please always keep in front of you the revolutionary message that you have committed yourselves to – and then think how great is this responsibility that you have undertaken and how precious is your every breath of life for this purpose? Please also note that it is only your movement – consisting of a small band of devotees – that has risen to deliver this Quran's revolutionary voice on

the face this Earth. The eyes of the world are set on you to see as to when the bold claim – that the solution of humankind's problems and suffering is with you – is going to be realized in practice. Research scholars from America and Europe come to me and when I present the idea of the Quranic system to them then I see a glow in their eyes. They become very thankful about it. But with subtle hesitation they say that who knows this system could be implemented in these times? When I tell them that we are trying very hard for it then their last words before departing are: we will be watching very carefully your efforts in this direction! From this you can very well imagine, my dear friends, what this responsibility is that you have undertaken on your shoulders; and how important it is to fulfill our claim? In your efforts lies the future welfare of entire humanity. If you shirk *this* responsibility then please think of how great a crime this will be considered in the court of Allah? Therefore, please put your heart and soul into this effort of spreading this message. It should not be the case that the destiny of humankind linked with enlightened hope of your efforts should become disillusioned and start crying in sadness and agony:

The smile came to us after a long time of fear;
But it was so bitter that it brought out bitter tears!

My dear friends, whatever I had to say I have said. This year my address to you is little short. This is because whatever details are needed about the Quranic constitution I will provide that in the open forum.

At this time, let me express my heartfelt thanks to you that you decided to participate in this gathering despite facing hardships of travel. As I have mentioned before, your arrival here for this gathering turns my solitude into joy of companionship – and this increases my age and my desire to live longer! May Allah increase the depth and breadth of your love and sincerity! And the purpose that you have undertaken in this journey, May the cosmic forces be your partner in this mission! My condition is that every breath of my life is spent in waiting for the establishment of this universal Quranic sustenance which guarantees that humanity will find its lost paradise once again. All night and day I call upon this lost paradise to arrive as soon as possible.

Do come on the shoulders of my restless hopes and aspirations;
I have been watching for a very long time; for your striding way!

I am sure that your beautiful wish is also included in this, my innocent wish.

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ۖ إِنَّكَ أَنْتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ۝

O our Sustainer! Accept our humble efforts because you are fully aware of what we speak and what is hidden in our hearts. (2:127)

4- وہ دائرہ اسلام سے باہر چوٹی کے حکماء اور فُضلاء کو ذہن میں رکھیں کیونکہ یہی لوگ ہیں جن کے قائل ہونے سے دنیا کی ذہنی فضا سے باطل تصورات کا اثر زائل کیا جا سکتا ہے۔

5- وہ علمی دنیا کے مسلمہ حقائق سے آغاز کر کے ان قرآنی حقائق کی طرف آئیں جن کی صحت لوگوں کے نزدیک مسلم نہیں۔

6- کسی غلط عقیدہ کی محض نفی مخالفین کو قائل نہیں کر سکتی جب تک اس کے مقابل کے صحیح تصور کا اثبات نہ کیا جائے۔

7- وہ ایک فلسفہ یا ایک فلسفیانہ خیال کی تردید کے لئے جن تصورات کو صحیح سمجھ کر کام میں لائیں تو کسی دوسرے فلسفہ یا فلسفیانہ خیال کی تردید کرتے ہوئے اسے غلط قرار نہ دیں۔ بلکہ اپنے موقف پر قائم رہیں۔

8- مغرب کے صحیح تصورات کو نہ تو رد کریں اور نہ ہی ان کے غلط تصورات کو قبول کریں۔

9- ہر غلط فلسفہ کے اندر وہ جن تصورات کو صحیح سمجھیں انہیں دوسرے فلسفوں کی تردید کرتے ہوئے غلط قرار نہ دیں اور جن تصورات کو غلط سمجھیں' انہیں دوسرے فلسفوں کی تردید کرتے ہوئے صحیح قرار نہ دیں ورنہ وہ اپنی تردید خود کریں گے۔

(3) ڈاکٹر برہان احمد فاروقی کا موقف:

1- کسی علمی صداقت کے ساتھ متصادم نہ ہو بلکہ ہر زمانہ میں تمام علمی صداقتوں کے ساتھ پوری طرح سے ہم نوا اور ہم آہنگ رہے اور جوں جوں علمی صداقتیں منکشف ہوں وہ اس کے اندر سماتی چلی جائیں۔

2- جس کے تمام تصورات ایک دوسرے کے ساتھ عقلی ربط وضبط رکھتے ہوں اور ایک دوسرے کی عقلی تائید اور توثیق کرتے ہوں۔ یہ اسی صورت میں ممکن ہو سکتا ہے جب اس کے تمام تصورات قرآن کے بنیادی تصور کے ساتھ عقلی طور پر متعلق ہوں۔

3- جو تمام باطل فلسفوں کی موثر تردید کرتی ہو۔

4- جو کائنات کا ایک مکمل فلسفہ ہو اور حقیقتِ انسان و کائنات کے اہم مسائل کے بارے میں عملی راہ نمائی کرتی اور صداقت اور سچائی کا راستہ بتاتی ہو۔

5- جو علمی تصورات کی خامیوں کو آشکار کر کے انہیں پاکیزہ اور شُستہ بناتی ہو۔

6- جو ہمیں احکامِ دین کی حکمتوں اور علتوں کے پورے سلسلہ سے آگاہ کرتی ہو اور ان حکمتوں اور علتوں کا ایک ایسا تصور دیتی ہو' جس میں اندرونی طور پر کوئی تضاد نہ ہو۔

(اشاعت کے لئے محترم ڈاکٹر انعام الحق نے تعاون کیا ہے۔)

PUBLISHED SINCE 1938 AT THE BEHEST OF ALLAMA IQBAL[R] AND QUAID-E-AZAM[R]

CPL.NO. 28
VOL.78
ISSUE
07

Monthly

TOLU-E-ISLAM

25-B, Gulberg 2, Lahore, Pakistan
Phone. 042-35714546
E-mail:idarati@gmail.com Web: www.toluislam.org
www.facebook.com/idaratolueislam1/ www.youtube.com/idaratolueislam

يَوْمَ لَا يَنْفَعُ مَالٌ وَّلَا بَنُوْنَ ۙ
اِلَّا مَنْ اَتَى اللّٰهَ بِقَلْبٍ سَلِيْمٍ ۭ

کیونکہ اُس وقت نہ تو کسی کا مال اُسے کچھ فائدہ پہنچا سکے گا اور نہ ہی اولاد۔
اُس وقت، فلاح و بہبود اسی کے حصے میں آئے گی جو "قلبِ سلیم" لے کر خدا کے سامنے جائے گا۔ (جو اپنے اختیار و اِرادہ، خواہشات اور آرزوؤں کو قوانین خداوندی کے سامنے جھکا ہوا رکھے گا۔ جو ان قوانین سے کبھی سرکشی اختیار نہیں کرے گا) (37:85)۔ (مفہوم القرآن از علامہ پرویز، سورۃ الشعراء: 88-89)